شبیر احمد کے فن کی شعریات اس
اسلوب کی رہینِ منت ہے، جس کے نشانات
بلونت سنگھ جیسے فن کاروں کے ہاں نظر آتے
ہیں۔ لیکن ان کا انفرادو امتیاز اس طور اور بھی
نمایاں ہے کہ ان نقوش کی داخلی بُنت میں
اساطیر کی بھید بھری دنیا، عصری سانگی میں
پنہاں بے ساختہ جبریت و جنسی تجسّس کو نیا معانی
پہناتی ہے۔ ان کے ہاں اساطیر کی بازآفرینی
اظہار جسمیں سے ان معنوں میں الگ ہے کہ وہ
تمثیلی اسلوب سے زیادہ بیانیہ کی سیال کیفیت کو
اظہار بخشتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں داستان
گوئی کی جدت، مثلاً کی تعبیر، متن کی ساخت شکنی،
ڈرامائی کیف و کم، اسطور آفرینی، لوک سائیکی،
نسائی احساس، جنسی انتہار سب موجود ہیں۔
انھوں نے کرداروں کے تشخص میں زبان کی
جس لسانیات کو برتا ہے، وہ روزمرہ، ہندی،
بنگالی، اُردو کے علاوہ "زبان کی نئی قواعد" کو
بھی فطری انداز میں پیش کرتی ہیں۔ نسائی
فطرت میں ان کے بیانیہ کا احساس بحال مزید
روشن ہو جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں نئی
عورت کی فرہنگ، تانیثیت کی علمبرداری سے
الگ اپنا وجودیاتی مظاہر پیش کرتی ہے۔
شبیر احمد کو اسلوب بیان کا تخلیقی جوہر
میسر ہے، اسی لیے ان کا فن پارہ نہ صرف اپنی
شناخت قائم کرتا ہے بلکہ اُردو فکشن کے نئے
اور منفرد مزاج کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔

شمشیر عالم زاہدی
کولکاتا

چوتھا فنکار

شبّیر احمد

TARUN DE '11

چوتھا فنکار

(کہانیاں)

(PDF Edition)

شبیراحمد

گلستان پبلی کیشنز

67 , مولانا شوکت علی اسٹریٹ (کولوٹولہ اسٹریٹ) کلکتہ-700073
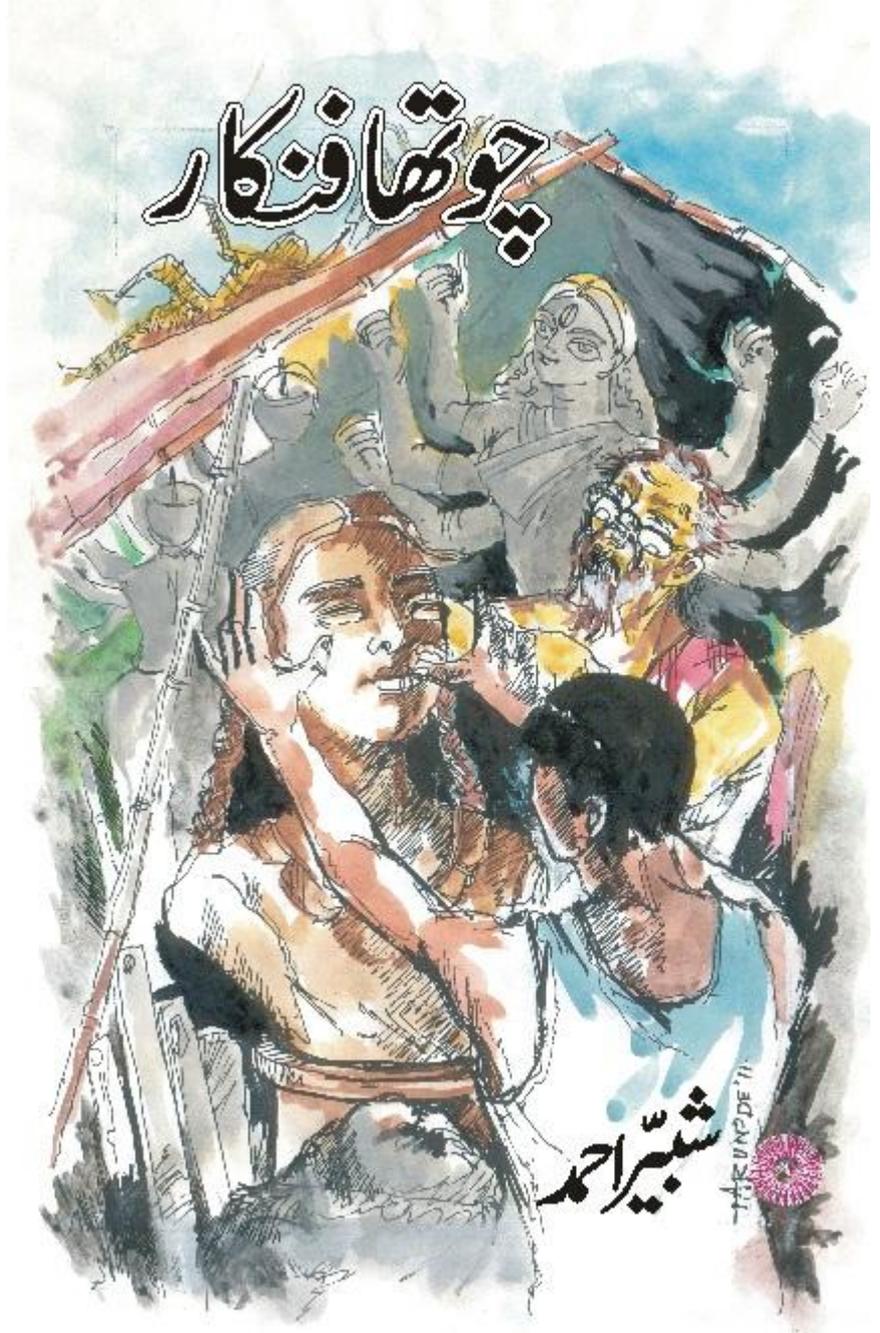
Chautha Fankar
A Collection of Short Stories by
Shabbir Ahmed

Year of Publication: 2012
Rs. *200/-*

کتاب	: چوتھا فنکار
مصنف	: شبیر احمد
مصنف کاپتا	1): 83D/6, بیل گچھیا روڈ' کولکاتا-700037
	2): 11B/1, کے.بی .بوس لین ، کولکاتا۔700033
مصنف کا موبائل نمبر	: 09681192694/08961491731
طبع اوّل	: 2012
صفحات	: 225
تعداد	: 500
قیمت	: 200/- روپے
ناشر	: گلستان پبلی کیشنز' 67۔مولانا شوکت علی اسٹریٹ' کلکتہ - 700073
کمپوزنگ	: شبنم احمد
سرورق	: ترون دے
مطبع	: وکٹوریہ پرنٹرز ، کلکتہ

Distributors :

GULISTAN PUBLICATIONS.
67 Maulana Shaukat Ali Street, Kolkata-700073.

MAKTABA JAMIA LTD.
Delhi, Mumbai, Aligarh.

BOOK EMPORIUM.
Urdu Bazar, Sabji Bagh, Patna-800004.

انتساب

عہدِ رفتہ کے نام

It is not because other people are dead that our affection for them grows faint, it is because we ourselves are dying.

Marcel Proust

Man must create his own essence: it is in throwing himself into the world, suffering there, struggling there, that he gradually defines himself. And the definition always remains open ended: we cannot say what this man is before he dies, or what mankind is before it has disappeared.

Sartre

یہ صفحہ

نانی ماں کے نام

از حالِ دل و زلفِ سیاہِ تو چہ آگاہ

آں کس کہ گہے مارِ سیاہش نگزیدہ است

حافظ

شمولات

یہ صفحہ

نکہت پروین

کے نام

جسے ہم پیار سے

چھٹکی

کہتے تھے!

دیباچہ

زندگی تجربات کا مرقع ہے ،اور فن انھی تجربات کو فنی وسائل سے ہویدا کرتا ہے ۔ کوئی شعر اس وقت تک اپیل نہیں کرتاجب تک اس میں کوئی ندرت نہ ہو ۔اسی طرح کوئی افسانہ اس وقت تک متاثر نہیں کرتا جب تک اس میں کوئی تجربہ تحیر ،تجسس اور اسلوب بیان میں پرکاری سے کمر بستہ نہ ہو ۔حیات انسانی دو پہلوؤں سے عبارت ہے....رومان اور حقیقت ۔ دونوں کی اپنی اساس ہے ،لیکن ایک کے بغیر دوسرے کی تکمیل نہیں ہوتی ۔افسانے کی بنت میں حقیقت زمین کا کام کرتی ہے ،جب کہ رومان اس میں رنگ و روغن چڑھاتا ہے ۔فنکار اظہار کے وسائل کہیں سے بھی لاسکتا ہے ،لیکن اپنی زمین سے کٹ نہیں سکتا ، اور زمین کوئی محدود شے نہیں ، کہ میل یا فرلانگ میں اس کی پیمائش کی جائے ۔کہانی کہنے والے کے ذہن میں پہلے کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور ہوتا ہے ،ورنہ بغیر وقوعے کے بیانیہ تشکیل نہیں پاسکتا ۔اس لیے بیان اور بیانیے کے تفاعل میں ایک رشتہ فن کا بھی ہوتا ہے ۔شبیر احمد کو کہانی کہنے کا گر آتا ہے ،لیکن بیان اور بیانیے کا تفاعل ان کے ہاں اتنا سادہ نہیں ،جتنا کہ بادی النظر میں معلوم پڑتا ہے ۔جملوں کی

ساخت ،لہجے کی متانت اور طنز کی کاٹ بیانیے کواستحکام عطا کرتی ہے ۔کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہربڑااورکامیاب تخلیق کا راپنی شعریات خود وضع کرتا ہے ۔استفادے اور اختراع میں فرق ہے ،لیکن یہ بھی سچ ہے کہ استفادہ جو سطح فراہم کرتا ہے ،اس کے نشیب و فراز میں اختراع گل بوٹے کھلاتا ہے ،اور یہیں سے ندرت کا چشمہ پھوٹتا ہے ۔شبیر احمد عمر کی جس منزل میں ہیں ،اس اعتبار سے انھوں نے لکھنا بہت بعد میں شروع کیا ،مگر مطالعے کا ذوق و جنون انھیں ہمہ وقت مختلف موضوعات اور شعبہ جاتِ علوم کی طرف مائل کرتا رہا ۔بنگلہ ادب سے ان کی خصوصی دلچسپی محض تفنن طبع کے لیے نہیں ، بلکہ استفادے کی وہ منزل ہے جہاں اختراعی قوتوں نے فن کا درجہ حاصل کرلیا ہے ۔ یہ بڑی بات ہے کہ اپنے موضوعات کے لحاظ سے ان کے افسانوں نے اردو فکشن میں تنوع کی ایک نئی صورت پیدا کی ہے ۔اپنے معیار و منہاج کے حوالے سے بنگلہ ادب میں فکشن کا سرمایہ نہایت وقیع ہے ۔اس سرمایے سے استفادے کی روایت بھی پرانی ہے ،لیکن اس روایت کو پہلی دفعہ شرح و بسط کے ساتھ مرکز میں رکھ کر شبیر احمد نے اردو افسانے کو تہذیبی مطالعے کی نئی دعوت دی ہے ۔انھوں نے نہ صرف براہِ راست ان متون کا مطالعہ کیا ، بلکہ عملی/تخلیقی طور پر بھی اظہار کا وہی پیرایہ اختیار کیا جس سے مقامی اسلوب اور لہجے کا سجیلاپن جھانکتا ہے ۔بنگال میں افسانہ نگاروں کی کمی نہیں ۔وہاں جس طرح گلی گلی میں شاعر پائے جاتے ہیں ،قریباً افسانہ نگاروں کا بھی وہی حال ہے ،مگر ایسے کتنے افسانہ نگار ہیں جو معاصر فکشن کے معیاری اسلوب تک پہنچتے ہیں ۔انگلیوں پر نام گنے جاسکتے ہیں ۔ظفر اوگانوی ، اقبال کرشن اور عابد ضمیر اب اس دنیا میں نہیں رہے ۔جو لوگ بقید حیات ہیں ،ان میں انیس رفیع ،صدیق عالم ،اظہارالاسلام اور شبیر احمد ۔فیروز عابد بھی اچھے لکھنے والوں میں ہیں ۔وہ خاموش ہیں ،مگر منظرنامے سے غائب نہیں ۔یہ وہ تخلیق کار ہیں جو معاصر فکشن کی اوج سے آنکھیں ملا رہے ہیں ،اور بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے

معاصر اردو افسانے میں اپنی شناخت پائیدار /مضبوط کرلی ہے ۔ان سب کا سفر جاری ہے ۔کون کتنی دور جائے گا ،نہیں کہا جا سکتا ،لیکن اس میں کوئی تردد نہیں کہ انھوں نے اپنی سرحدیں توڑ دی ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ بلا تخصیص مِکان ان کے قارئین کا حلقہ کافی وسیع ہے ۔

شبیر احمدکے افسانے پر دو ٹوک رائے دینا مشکل ہے ۔ان کے فنی رموز آسانی سے ہاتھ نہیں لگتے ۔ افسانے کی جزئیات اور فنی عناصر کوبرتنے میں وہ سنجیدگی سے کام لیتے ہیں ۔ ان کے افسانے کا بنیادی یا نقطہ عروج پیٹرن (Pattern)یہ ہے کہ کلائمکس (Climax) افسانے کے اخیر میں آکرسوالات اور مطالب کا ہجوم برپا کرتا ہے ۔قصہ کہنے میں تجسیم ، تکنیک ،ٹریٹمنٹ اور فنش (Finish)کا جو انداز ہے وہ بیانیے کو دلچسپ اور مربوط بناتا ہے ۔ ان کے بیانیے کو بعض صورتوں میں سادہ کہا جا سکتا ہے ،لیکن سادگی میں پرکاری پیدا کرنا ہر کس و ناکس کی بات نہیں ۔ٹریٹمنٹ کی سطح پر ان کے افسانے کاجو مزاج ہے اس میں ڈرامائی کیفیت بھی ہے اور تہ داری کا وصف بھی ۔پھر بھی اس تہ داری میں ترسیل مسئلہ نہیں بنتی ، کیوں کہ وہ استعاروں اور علامتوں کے محل ِاستعمال سے واقف ہیں ،اور انھیں ٹول (Tool) کی حیثیت سے دیکھتے ہیں ۔ یہ نہیں کہ محض انھی کو توجہ کا مرکز بنالیں ۔کہانی کہانی کے انداز میں آگے بڑھتی ہے اور اپنے برتاؤ میں تخلیقی بافت کی پیچیدگی کو آسان بنادیتی ہے ۔ان کا کوئی بھی افسانہ پڑھ لیجیے ، اس میں مکالمے کا فطری پن نظر آئے گا ،اور وہ روزمرہ پر مبنی ہوں گے ،جن میں ماورائی عناصر کا دخل نہیں ۔زمین کی بات زمین پر اتر کر کہنا ان کا فن ہے ،لیکن یہ برتاؤ کی سطح پر مشکلات پیدا کرتا ہے ، اور فن کے مجروح ہونے کا خدشہ بھی ،مگر انھوں نے بہت خوش اسلوبی سے ان معاملات کو طے کیا ہے ۔

شبیر احمدکے افسانے اردو کے معیاری رسائل میں شائع ہوئے ۔یوں ہی ان کے
چند افسانوں کے نام لے لیجیے....بسرجن ،چوتھا فنکار ،پنر جنم ،پاروتی سے پارو تک ،
انفکشن.. ...۔'بسرجن'کو'ذہن جدید'نے شائع کیا۔اس افسانے سے انھیں کافی شہرت
ملی۔ اس میں حقیقت اور رومان کا حسین امتزاج ہے ۔اس کی بافت میں تحیر کی
دبازت ہی اس کا جوہر ہے ،جو جمالیاتی حس کو بھی انگیز کرتاہے ،اور اس کی
تفہیم کو بھی رومان انگیز بنادیتا ہے۔ اندرنیل اس عہد کا با ضمیر اور با خبر کردار
ہے ۔اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا
چاہتا ہے ۔بوڑھے کا کردار افسانے کو علامتی بنا دیتا ہے ۔عنوان (بسرجن) اوراس کردار
نے مل کرافسانے کو اساطیری رنگ بھی دے دیا ہے ۔یہ افسانہ ان رویؤں پر شدید طنز
ہے جن میں آدمی غلط کو صحیح کی عینک سے دیکھنے کا عادی ہو چکا ہے ،اور اسے
اپنی غلط کاریوں کا احساس تک نہیں ۔اگر بوڑھے کو ضمیر کی علامت مان لیں تو
اس کی موت خود اندرنیل کی موت ہے ۔اس طرح اندرنیل قاتل ہوتے ہوئے بھی مقتول
ہے ،مگر اس ضمن میں کسی حتمی نتیجے تک پہنچنا مشکل ہے ۔افسانے کی بنت
میں شروع تا آخر تحیر کے احساس کے ساتھ سوالوں کا مضبوط حصار بھی ہے ،جس
میں گھر کر قاری متن سے مکالمے کی صورت پیدا کرتا ہے ۔یہی اس کا حسن ہے کہ
یہاں سے نتائج کے کئی سرے نکلتے ہیں ۔اس کی تہ داری تفہیم کو ذرا مشکل ضرور
بنا تی ہے ،لیکن اسے ہم چیستاں قطعی نہیں کہہ سکتے ۔ابہام اور ادراک کی آمیزش
نے اس کے جمالیاتی افق کو روشن کیا ہے ۔صارفیت اس عہد کا اہم ترین مسئلہ
ہے ۔اس کے اثرات یہاں بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں ۔بوڑھے کا کردار انتہائی
پیچیدہ ہے ۔افسانے میں اس کا دخل خال خال ہے ، لیکن اس کے داستانی رنگ نے
قاری کو تجسس کے وافر سامان فراہم کیے ہیں ۔یہ کردار پہلے انسانی نفس ،پھر ضمیر
کی علامت بنتا ہے ۔اسی کردار کے توسط سے افسانہ آخری ٹچ(Touch)کوپہنچاہے:

جنگلی بھینساڈکرایا ۔اس نے زور سے زمین پر پاؤںمارکر خاک اڑائی ۔لیکن وہ ڈری نہیں ۔

ڈرتی کیسے ،وہ تو کوئی معمولی عورت نہیں ۔کالے پہاڑجیسا وہ وحشی بھی معمولی بھینسا نہیں ۔سینگ کی نوک سے دنیا کو زیر و زبر کرنے کی قوت رکھتا ہے ۔تمام توانائی سمیٹ کر اس کی طرف دوڑا ۔ پاروتی پھر بھی نہیں گھبرائی ۔داؤ کے دستے پر گرفت مضبوط کی اور ڈٹی رہی ۔اس وحشی نے پاروتی کے پیٹ مینسینگ داخل کرنے کے لیے جوں ہی اپنا سر جھکایا ، پاروتی نے کھچاک سے ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کردیا ۔ بھینسے کا سر دھم سے پاروتی کے قدموں میں آگرا ۔

اور پاروتی چونک کر جاگ اٹھی ۔پاس لیٹا ہوا گاہک اچانک کھڑا ہوگیا ۔ گھبرا کر پوچھنے لگا, ''کیا ہوا ؟''

''کچھ نہیں ۔ ''اس نے دیوار پر ٹنگی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی ۔ رات کے دو بج رہے تھے ۔ ''ہو گیا ؟''

'' کیا!'' گاہک اب بھی ہکّا بکّا کھڑا تھا ۔

یہ اقتباس 'پاروتی سے پارو تک ' کا آ غاز ہے ۔اردو میں 'طوائف' پر بہت سے افسانے لکھے گئے ۔منٹو کے بعد چند ہی لوگ ہیں ،جنھوں نے اس موضوع کا حق ادا کیا ۔ اس موضوع پر شبیر احمد کا یہ افسانہ ، نہ صرف بہت کامیاب اور منفرد ہے ،بلکہ اردو فکشن میں اہم اضافہ بھی ہے ۔یہ اس کردار کی گاتھا ہے جس کی نفسیات کا ادراک نہایت مشکل ہے ۔ سفاک معاشرے میں ایسے کردار سے ہمدردی نہیں ہوتی ۔ایسے کرداروں کی ضرورتوں اور مجبوریونپر پردہ ڈالنابہت آسان ہے ۔منٹو نے ایسے ہی سماج کی کھوکھلی تہذیب و اخلاق کی دھجیاں اڑادی تھیں ۔شبیر احمد نے اس سب آلٹرن (Subaltern)کردار کے توسل سے حقیقت پر پڑے پردوں اورجمی ہوئی دبیز گرد کی تہونکو کھرچ ڈالا ہے ۔یہ محض ایک چکلے یا پاروتی کی کہانی نہیں ،بلکہ معاشرتی جبر کا وہ المیہ ہے جس مینلاچاری نہ جانے کتنی ہی پاروتی کو پارو بننے پر مجبورکردیتی ہے ،اور یہ حقیقت ِخوں چکاں اپنی شکل بدل بدل کر ہوس کو تماشا بناتی رہتی ہے ۔یہ افسانہ صحیح اور غلط کا رزم نامہ ہے ، جس میں سچائی کو شکست ہوتی ہے ۔سچائی کا مفہوم بدل جاتا ہے اور یہ شکست ہی سب سے بڑی

سچائی بن جاتی ہے ۔یہ نہ صرف تکنیک ،ٹریٹمنٹ اور فنش کے اعتبار سے منفرد ہے ،بلکہ اس کا مخصوص سیاق بھی اس کے اختصاص کو نشان زد کرتا ہے ۔افسانے کی بافت میں جو پس منظر ،پیش منظر اورواقعات آئے ہیں ،ان کا تعلق مخصوص سیاق سے ہے ۔جب تک قاری اس سے آگاہ نہ ہو ،زیادہ لطف حاصل نہیں کرسکتا ۔ ان تجربات میں زندگی کرنا اور اس عمل میں احساس کو بیدار ، رکھنا ہی قرات کا انصاف ہے ۔چوتھا فنکار 'شبیر احمد کا شاہکار ہے ۔اس افسانے میں اس روایت کو مرکز بنا کر بیانیہ خلق کیا گیا ہے:

چاردوست تھے ۔چاروں نے بھگوان وشوکرما سے پرارتھنا کی," اے بھگوان ,ہمیں کوئی انوکھا فن سکھلا دے ۔" بھگوان وشوکرما نے ان کی پرارتھنا سوئیکار کرلی ۔انھیں بارہ برس تک سکھاتے رہے ۔وہ بھی پوری جی جان سے سیکھتے رہے ۔ پہلے نے ہڈیاں جوڑ جوڑ کرڈھانچہ بنانا سیکھا ۔ دوسرے نے اس پر ماس جمانا سیکھا ،تیسرے نے اس پر چمڑے کا غلاف چڑھانا سیکھا ۔

یہ افسانہ چوتھے فنکار کی تلاش اور تکمیل سے عبارت ہے ۔یہ موضوع ، اسلوب ، تکنیک ،ٹریٹمنٹ ،فنش بہ ہر لحاظ مربوط ،دلچسپ ،نادر ،پر تجسس ،پر کیف اور فنی لوازمات سے لیس ہے ۔مورتی بنانا خود ایک نازک فن ہے ۔اس کے لوازمات ،جزئیات اور فنکاری کا بیان تخلیق کار کے پختہ شعور ،ٹھوس /پرکارتجربے اور فن کی نزاکتوں سے آگاہی پر دال ہے ۔ چوتھے فنکار کا ادراک انسانی عظمت کا اعتراف ہے ۔یہ نہ صرف فنکار کی حیثیت اور فن کی رفعت کا اقرار ہے ،بلکہ قاری کے لیے خوش گوار تجربہ بھی ۔یہاں تجربے کی دبازت کے ساتھ فنکارانہ خلوص بھی ہے ۔یہ افسانہ جمالیاتی تفاعل مینتخلیقی مراقبہ ہے ۔یہاں شبیر احمد کا فن اپنی معراج کو پہنچا ہوا ہے ۔اختتام میں جو کلائمکس (Climax)ہے ،وہ ذہن میں تحیر اور مسرت کا خوبصورت امتزاج بناتا ہے

بوڑھے کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ۔وہ ڈرتا ڈرتا پر تیما کے قریب آیا ۔دم بخود کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا ۔ پھر لڑکے کی طرف مڑا ۔اسے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا! پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا!!اور دھم سے اس کے قدموں پر آگرا!!

پرتیما اب بھی بول رہی تھی ،''اور چوتھے نے روح پھونکی....! اور چوتھے نے روح پھونکی...!!!''

'پنر جنم'کا بیانیہ شدیدتحیر کی عجیب و غریب کشمکش اور کیفیات پر مبنی ہے ۔زندگی کے ممکنات و مضمرات سے ہم کنار یہ افسانہ وجودی منطق کی تلاش اور جواز کی گاتھا پیش کرتا ہے ۔ اسے ہم خود فریبی کی منزل بھی کہہ سکتے ہیں ،لیکن منطقی جواز زندگی کی ما بعدالطبیعیات (Metaphysics) کو شکست نہیں دے سکتا ۔اس لیے یہ زندگی کی باز آفرینی بھی ہے اور غیر شعوری رشتہازلی کا ایقان بھی ۔'مد و جزر'صنفی /جنسی استحقاق اور آزادی کے احساس کے مابین کشمکش کا فنی اظہاریہ ہے ۔مرد اساس معاشرہ ہو یا کوئی اور...زندگی ذاتی عمل ہو یا اجتماعی....مرد و عورت کے تعلقات کی نوعیت بدلتی رہتی ہے ۔نظریے کا تصادم ، ضروریات اور خواہشات کا اژدہام ،نفسیات کی پیچیدگی اور ترجیحات کے معاملات ہر لحظہ زندگی کو نئے طور اور نئی برق تِجلی سے روشناس کراتے ہیں ۔'مد و جزر'میں ترجیح کی منطق فلسفیانہ اساس پر قائم ہے ۔'ڈوبتے سورج کا منظر'نئی اور پرانی قدروں کا آئینہ دار ہے ۔ نفسیاتی الجھنوں کی عکاسی ، جذبات کی ترجمانی اور منظر نگاری کی کامیابی میں قصہ کہنے کا روایتی ڈھب بھی شامل ہے ،جو انبساط کی لہروں کو چھیڑتا ہے ۔ 'انفکشن' عصر حاضر کے ایک سلگتے ہوئے مسئلے پر خلق کیا گیا افسانہ ہے ۔ایسے موضوع کے انتخاب مینکہانی کے سپاٹ ہونے کا ڈر رہتا ہے ، لیکن ایمائی انداز کو برقرار رکھتے ہوئے تخلیق کار نے کہانی کو متانت عطا کی ہے ۔ یہاں پیچیدگی ضرور ہے ،لیکن جھول /سقم نہیں ۔دانت کو علامت بناکردہشت کے مہیب سایے مینجنم لینے والی کیفیات کی نیرنگی اور تذبذب کی بوالعجبی کو آشکار

کیا ہے۔ اس موضوع پر ایک تو افسانے ہی کم لکھے گئے ،مزید یہ کہ اپنے موضوع اور برتاؤ کے لحاظ سے یہ اب تک کا بہترین افسانہ ہے۔ نظریاتی ٹکرا ؤ میں اپنی اساس کے جواز کی تلاش کو مرکزیت حاصل ہے ،لیکن اس کی ترسیل میں قاری کسی خانے میں مقید نہیں ،بلکہ تذبذب کے دوراہے پر کھڑا ہے۔'کہرآلود ندی' ، 'شہر اماں کی تلاش' ، 'اعتراف'....یہ وہ افسانے ہیں جو عصری معاشرتی مسائل و میلانات اور ان کے جبر کو طشت از بام کرتے ہیں ،اور مروجہ نظام کے خلاف احتجاج کی علامت بن گئے ہیں۔'سفوکلس کا المیہ'بھی قدروں کی پامالی کا نوحہ ہے ، مگر یہاں شور کے بجائے پر شکوہ سکوت ہے۔

شبیر احمداپنے ڈھب کے تنہا افسانہ نگار ہیں ،جنھوں نے بہت کم مدت میں اپنا اسلوب وضع کیا ہے۔ان کے ہاں تخلیقی تجربہ اپنے عمق میں آرٹ ،کرافٹ اور لسانی تفاعل کے تخیلی پیکر تراشتا ہے ،جس میں الفاظ کا تنوع منفرد رچا ؤ کے ساتھ اسلوب کی نادرہ کاری کو کمک پہنچاتا ہے۔انھوں نے عصری موضوعات کے اطلاق میں قصہ پن پیدا کرکے لہجے کو تابانی / استقامت عطا کی ہے۔ان کا راوی یا تو واحد متکلم حاضر ہوتا ہے یا غائب ،جو قصہ سناتا جاتا ہے ، اور اس میں حقیقت پر مبنی واقعات ضم ہوتے جاتے ہیں۔اس طرح قاری کے لیے ایک رومان انگیز فضا بنتی جاتی ہے۔ان کے بیانیے میں طنز ،تضاد ،عمل اور رد عمل کی متعدد صورتیں سامنے آتی ہیں۔کرداروں کی ذہنی تقلیب ،تحرک اور ارتقا کا عکس اجالتی ہے۔اب سوال یہ ہے کہ ان کے افسانے کی مطالعاتی نہج کیا ہو؟یہ سچ ہے کہ تنقید پہلے متن سے مکالمہ کرتی ہے ،پھر اس کے بطن میں اتر کر سیاق ڈھونڈتی ہے۔شبیر احمد کے افسانوں کے سیاق میں وہ تلخ زمینی حقائق ہیں ،جن سے آج کا انسان جوجھ رہا ہے۔یہ مسئلہ ذات سے نکل کر کائنات تک پہنچتا ہے۔ انھوں نے جن سیاق میں کڑیاں جوڑی ہیں ، ان میں مٹی کی خوشبو کا احساس اغلب ہے۔بنگال کی تہذیب اور اس کے

مضمرات کو مرکز میں رکھ کر انھوں نے واقعات کو تخلیقی بنت کا حصہ بنایا ہے۔یہی ان کا انفراد و اختصاص ہے۔اردو قاری اب تک بنگلہ فکشن کے تراجم سے محظوظ ہوتا تھا۔اب براہِ راست حسن ِبنگالہ کے تخلیقی جوہر سے ہم کلام ہوگا۔شبیر احمد نے بھی اپنے افسانے میں وہی کام کیا ہے ، جو ان کے ایک کردار 'چوتھے فنکار'نے کیا تھا:

پرتیما اب بھی بول رہی تھی ،''اور چوتھے نے روح پھونکی!اورچوتھے نے روح پھونکی!!!''

٭٭٭

معیدرشیدی ، نئی دہلی

اعتراف

وہ صبح سات بجے آتی اور کام کاج نمٹاکر دس بجتے بجتے چلی جاتی ۔اس کے جاتے ہی صومان اور قوسیہ بھی بیٹے کولے کر نکل پڑتے ۔ اسے اسکول بس میں بٹھاتے اوراپنے اپنے دفتروں کو چل دیتے ۔

شام کو وہ سڑک پرکھڑی رہتی اور جب سرحان کی بس آجاتی تو اسے لے کر گھرچلی آتی ۔اس کا ہاتھ منہ دھلاتی ، کپڑے بدلتی اور دودھ گرم کرکے اسے پلاتی ۔ اس درمیان صومان اور قوسیہ بھی دفترسے لوٹ آتے ۔ وہ ان کے لیے چائے وائے کاانتظام کرتی ، اورپھر رات کا کھانا پکاکر اپنے گھرچلی جاتی ۔

مگراس دن صومان اکیلے ہی لوٹا تھا ۔ قوسیہ نہیں آئی تھی ۔

اس نے پوچھا ،''باجی ابھی تک آئی نہیں ہے ۔ آپ کو چائے دے دیں ؟''

صومان نے کہا ،"ہاں ، عبیدہ دے دو ۔وہ آج دیر سے آئے گی ۔کہہ رہی تھی دفتر میں میٹنگ ہے ۔"

اور اس روز قوسیہ رات کے نوبجے لوٹی تھی ۔ نڈھال ،تھکی تھکی سی!!

ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی ۔ قوسیہ گھر میں داخل ہوئی ۔ کھلی چھتری دروازے کےپاس رکھ کر گھر کا سرسری جائزہ لیا ۔

سرحان اندر کمرے میں سورہا تھا اور صومان اس کے سرہانے بیٹھا تھا ۔ ایک ہاتھ سے اس کا سر سہلارہاتھا اور دوسرے میں ایک کتاب تھامے پڑھ رہا تھا ۔

عبیدہ ڈرائنگ روم میں صوفے سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھی قوسیہ کاانتظار کر رہی تھی ۔ اسے دیکھتے ہی سنبھل کر بیٹھ گئی ۔

قوسیہ نے اسے ایک نظر دیکھا اور پوچھا ،''تو ابھی تک گئی نہیں ؟ "

اوراس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دے پاتی ، قوسیہ اندرکمرے میں چلی گئی ۔ تھوڑی دیر بعد عبیدہ اپنی جگہ سے اٹھی اور چلّا کر بولی ،''باجی ، ہم جارہے ہیں ۔ دروازہ بند کر لیجئے ۔ "

قوسیہ اندر کمرے سے آئی ۔ اس کے پیچھے پیچھے دروازے تک گئی ۔دروازے کے پاس چپل کا رَیک تھا ۔عبیدہ چپل نکالنے کے لیے جھکی اور کچھ دیرتک اسی طرح جھکی رَیک ٹٹولتی رہی ۔پھر اپنی چپل تھامے باہر چلی گئی ۔ قوسیہ نے پیچھے سے دروازہ بند کردیا ۔

مگر وہ دروازہ بند کر کے مڑی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی ۔ اس نے مڑ کر دروازہ کھولا ۔دیکھا ، سامنے عبیدہ کھڑی ہے ۔

چھتری قوسیہ کے پاوں کے قریب کھلی پڑی تھی ۔عبیدہ نے چھتری کی طرف نگاہ کر کے کہا ،''باجی ، پانی پڑ رہا ہے ۔ چھتری لے جائیں ؟ صبح لے آئیں گے ۔ "

اور قوسیہ کے ہامی بھرتے ہی ، اس نے جھک کر چھتری اٹھائی اور اسے بند کرنے لگی۔ بند کرتے وقت چھتری اس کے ہاتھوں سے پھسل کر قوسیہ کے پیر کے پاس گرگئی۔ عبیدہ نے جھک کر چھتری اٹھائی اور مسکراتے ہوئے کہا ، ''ہاتھ سلپ کر گئی''!!

قوسیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔خاموش دم سادھے کھڑی رہی۔اور جب عبیدہ چھتری لے کر چلی گئی ، تو اس نے غور سے اپنی شلوار کا پائینچا دیکھا اور ٹھٹک کررہ گئی۔ سراسیمہ سوچنے لگی ،''کہیں اس کمبخت نے دیکھ تو نہیں لیا ؟ لگتا ہے ،دیکھ لیاہے ۔ جبھی تو بار بارپاوں کے پاس جھک رہی تھی۔

وہ اندر ہی اندر بدبدائی ، " اگر دیکھ بھی لیا تو کیا ہوا ؟اس کا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ پائے گا۔ نہیں نہیں ،وہ سمجھ گئی ہے۔اتنی بھولی نہیں ۔گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا ہے اس نے۔ سات گھروں میں کام کرتی ہے۔سب جانتی ہے۔دیکھانہیں ،کس طرح بہانے ڈھونڈ ڈھونڈکر پیروں کے پاس منڈلارہی تھی!! باربارجھک رہی تھی "!!!

اس کے ذہن پر خوف چھانے لگا ۔ وہ شلوار سیدھی کرنے جلدی سے باتھ روم میں گھس گئی۔

قوسیہ ایک سیلف میڈ عورت تھی۔ اس نے زندگی کے نشیب و فراز دیکھے تھے۔ بہت جدوجہد کے بعدوہ یہاں تک پہنچی تھی۔ صومان اور وہ ایک ہی کالج میں پڑھاکرتے تھے۔ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے ۔ دوران تعلیم ہی صوما ن ریاستی حکومت کے ایک شعبے مینکلرک کے عہدے پر بحال ہوگیاتھا۔ شادی کے دوسرے ہی سال ان کے گھر ایک ننھی سی پری نے قدم رکھا۔ زندگی ہنسی خوشی سے گزرنے لگی ۔دیکھتے ہی دیکھتے علفہ تین سال کی ہوگئی ۔انھوں نے بیٹی کوبڑے شوق سے انگلش میڈیم اسکول میں داخل کرایا ، لیکن کچھ دنوں کے بعد ان کایہ شوق انہیں گراں گزرنے لگا ۔شروع شروع میں وہ چھوٹی موٹی ضرورتوں سے سمجھوتاکرتے

رہے ،لیکن جب پانی سر سے اونچا ہونے لگا ،تو قوسیہ نے بھی نوکری کرنے کامن بنالیا۔ صومان کوبھلا اس میں کیا اعتراض ہو سکتاتھا ؟ گھراور بچی کی دیکھ بھال کے لیے ایک دایہ رکھ کر وہ ایک کال سنٹر سے منسلک ہوگئی ۔ تبھی سے عبیدہ اس گھر میں کام کررہی ہے ۔رفتہ رفتہ ان کی مالی حالت سدھرتی گئی۔ پھر سرحان پیدا ہوا اور اس کی پیدائش سے ان کی خوشیاں دوبالا ہوگئیں۔

دیکھتے دیکھتے پندرہ سال گزرگئے ۔اس دوران مینقوسیہ کو چھوٹی موٹی کئی ترقیاں ملیں۔مگر اس بار ڈپٹی سیلز مینیجر کی پیشکش تھی۔اس عہدے کو حاصل کرنے کے لیے اس نے کیا کچھ نہیں کیاتھا ۔ کئی لوگ اس عہدے کے دعویدار تھے ،پر کمپنی کا ایم ڈی قوسیہ پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہوگیاتھا۔

لیکن اب وہ شش و پنج میں پڑگئی تھی۔ کمپنی کی پالیسی کے مطابق اسے کم از کم دو سال جنوبی ہند میں گزارناتھا ۔ شوہر اور بیٹے سے علیحدگی کا احساس اس کے لیے پابہ زنجیر بن رہا تھا ۔مگر اسے اپنی معاشی حالت سدھارنے کی بھی فکر لاحق تھی۔

علفہ بنگلور کے ایک انجینئرینگ کالج میں پڑھ رہی تھی ،اور سرحان کلکتہ کے ایک انگلش میڈیم اسکول میں۔علفہ کی پڑھائی کے لیے انھیں بینک سے قرض لینا پڑا تھا ۔ اسے ہر مہینے ایک موٹی رقم بھی بھیجنی پڑتی تھی ۔سرحان کے اسکول کا خرچ بھی کم نہ تھا۔ ٹیوشن کی فیس ، گاڑی کا کرایہ ،کتاب کاپیاں ، اوراس پر روز افزوں زندگی کی دیگر فرمائشیں! لیکن آمدنی کاسب سے بڑا حصہ فلیٹ کی خریداری پر لیے گئے قرض کی ماہانہ قسط ادا کرنے میں چلا جاتا تھا ۔ غرض یہ کہ کھینچ تان کر بمشکل گھر چلتاتھا ۔اسی وجہ سے قوسیہ نے یہ پروموشن حاصل کیا تھا ۔ اس کے لیے جائز ناجائز کی حدیں بھی توڑی تھیں۔ لیکن یہ بات بھی سچ تھی کہ وہ اپنے شوہر

کوبہت پیار کرتی تھی ۔اسے اکیلا چھوڑ کر جانا اسے گوارا نہ تھا ۔ وہ دل گرفتہ ہوکربولی ،" اگر میں چلی گئی توآپ کو تکلیف ہوجائے گی نا ؟"

صومان نے شرارت بھرے لہجے میں کہا ،" تکلیف! ہاں ،سو توہو گی!لیکن محترمہ ، صبرنام کی بھی کوئی چیز ہے اس دنیا میں!!میں صبر کرلوں گا!! بس بیچ بیچ میں آتی رہنا ۔ ہماری مرادیں پوری ہوتی رہیں گی ۔ ہمارا کام چلتارہے گا ۔ "

قوسیہ نے زیرِ لب مسکرایا ،"پھر وہی شرارت !ٹھیک ہے آپ کو صبر کرنے کی ضرورت نہیں!! آپ بھی میرے ساتھ چلئے ۔ہم سرحان کا وہیں کسی اچھے سے اسکول میں داخلہ کرادیں گے ۔"

صومان کندھا اچکا کر دونوں ہاتھ پھیلا تے ہوئے بولا ،" ویل ، آئیڈیا برانہیں ہے ۔"

قوسیہ نے ہنستے ہوئے کہا ،"تو چلئے آپ کابھی سامان پیک کر دیتی ہوں"!

صومان نے کہا ،"مگر محترمہ ،آپ شاید بھول رہی ہیں ،کہ ہم سرکاری نوکر ہیں ۔ بیوی کی زچگی پرشاید ہمیں میٹرنٹی لیو مل جائے ،لیکن اس کی ترقی پر لیئن ملنے کی کوئی گنجائش نہیں ۔ اگر ایسا ہوتا تو یقیناًمیں آپ کا اٹیچی بن جاتا ۔البتہ ،ایک راستہ ہے ۔"

"ارے واہ!کیا بات ہے !!"اس نے شوہر کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور آنکھ مارکر کہا ،"چلئے ،اب آ پ کی مراد یں روازانہ پوری ہواکرینگی ،وعد ہ رہا!!مگر سنوں تو ، وہ راستہ ہے کیا ؟ "

صومان نے اس کے کندھے پردونوں ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ، " میری جان ،وہ راستہ یہ ہے کہ میں اپنی نوکری سے استعفیٰ دے دوں ۔"

یہ سنتے ہی قوسیہ کے چہرے کارنگ اڑ گیا ۔اس نے بجھی ہوئی آواز میں کہا ،"اگر ایسا ہے تو آپ کوجانے کی ضرورت نہیں !میں اکیلی ہی چلی جاوں گی ۔آپ اپنااور سرحان کا خیال رکھئے گا بس ۔"

دوسرے دن قوسیہ چالاک شکاری کی طرح دوربیٹھی عبیدہ کو بھانپ رہی تھی ۔ اور جب اسے یہ ا طمینان ہوگیا کہ وہ بالکل نارمل نظر آرہی ہے تواس نے اسے بلاکر کہاکہ وہ دو سال کے لیے کوئمبٹورجارہی ہے ۔ اس کی غیر موجودگی میں وہ گھر کی پوری ذمہ داری سنبھال لے ۔کسی اورگھر میں کام نہ کرے ۔وہ اس کے عوض اسے اتنے روپے دے دیا کرے گی کہ کسی طور اس کا نقصان نہ ہوگا ۔ اور یہ طے ہوگیاکہ وہ ہر روز صبح دس بجے اپنے گھر چلی جائے گی اور شام چار بجے کام پر آجائے گی ۔

اور جب قوسیہ جنوبی ہند کے لیے راونہ ہورہی تھی ،توعبیدہ بھی اسے چھوڑنے ائیرپورٹ گئی تھی ۔قوسیہ رہ رہ کر اسے کن انکھیوں سے دیکھ رہی تھی ۔ہزار کوششوں کے باوجود وہ اس بات کو اپنے ذہن سے نہیں جھٹک پارہی تھی ۔جب بھی عبیدہ نیچے دیکھتی ، قوسیہ کادل دھک سے ہو جاتا ، "کہیں وہ میری شلوار میں الٹے ہوئے پائینچے تو نہیں ڈھونڈ رہی ہے ؟"

اور وہ جب پوری طرح مطمئن ہوگئی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے ، یہ محض اس کا ذہنی فتور ہے ، تو اس نے عبیدہ کو اشارے سے بلایا ۔اسے تاکید کی ،اورپھر تاکید کی ،" دیکھ عبیدہ! تجھ پر بھروسہ کر کے جارہی ہوں ۔گھر کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنا ۔سرحان اور اس کے ابّوکاخیال رکھنا ۔ رات کو سرحان کے پاس ہی سونا ۔خبردار ،اس کے پاس سے ہٹنا نہیں ۔ اسے نیند میں چلنے کی عادت ہے ۔اور ہاں ،ان کے کمرے میں مت جانا ،انھیں اکتاہٹ ہوتی ہے "

قوسیہ کوئمبٹور چلی گئی۔ عبیدہ سرحان اور صومان کاخیال رکھنے لگی ۔ بازار جاتی ، ان کی من پسند چیزیں خرید لاتی۔سرحان کو ابلے ہوئے انڈے پسند نہیں۔وہ اس کے لیے کبھی چاومین بناتی ، کبھی سینڈ وچ! اور کبھی ٹماٹر اور انڈے کی بھجیا۔اسے اپنے ہاتھوں سے کھلاتی۔سرحان دودھ دیکھ کر منہ بناتاتو وہ اس میں کبھی کمپلان ،کبھی بورن ویٹااور کبھی مائیلو ملا دیتی ۔ صومان کو موڑھی پسند تھی۔اس لیے وہ شام کے ناشتے کے لیے موڑھی لاتی اور سرسو ں تیل میں پیاز مرچ لال کرکے اس میں موڑھی اور مونگ پھلی بھون دیتی۔ صومان کے ٹفن بکس میں ایک عدد سندیش رکھنانہیں بھولتی ۔رات کا کھانا دیتے وقت گرم بھات پر کبھی مچھلی کا تلاہوا تیل اور کبھی مچھلی کے تلے ہوئے انڈے رکھ دیتی۔

دن گزرتے گئے ۔ صومان اور عبیدہ کے درمیان فاصلہ گھٹتاگیا۔شروع مینعبیدہ کا سر آنچل سے پوری طرح ڈھکارہتا تھا ۔ لیکن دھیرے دھیرے اس کے سر سے آنچل سرکتاگیا۔اب اس کی ناگن جیسی بل کھاتی ہوئی چوٹی نظر آنے لگی تھی۔ بلاوز کے اوپر نیچے پیٹھ کاحصہ بھی دکھائی دینے لگا تھا۔کپڑا دھوتے ، سبزی کاٹتے اور برتن مانجھتے وقت اس کی پستانیں ابل آتی تھیں۔

پھر ایک دن یوں ہوا کہ صومان نے اسے پیچھے سے آدبوچا ۔ عبیدہ نے خود کواس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہادیکھئے صاحب ،ہم آپ کادکھ سمجھ سکتے ہیں ۔کئی دنوں سے آپ کی حالت بھی دیکھ رہے ہیں ، مگر ہم مجبور ہیں ۔اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ ہم سے خوشی حاصل کریں ، تو آپ کو قیمت چکانی ہوگی۔“

صومان نے اسے اپنے سینے کے قریب کھینچااور بدبداتے ہوئے کہا ،” جب تک قوسیہ نہیں آ جاتی ،تب تک ہم دوست کی طرح نہیں رہ سکتے ؟“

عبیدہ نے پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا ،” صاحب ، مالک اور نوکرمیں دوستی نہیں ہوتی۔سودا ہوتا ہے۔ اس لیے دوستی وستی کی باتیں رہنے دیجئے ۔ اگر

آپ کومنظور ہو تو رکھئے قیمت ہماری ہتھیلی پر!!” عبیدہ کواپنی حدود کا احساس تھا۔اس نے کبھی صومان کے ساتھ ڈائینگ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا۔نہ کبھی اس کے الٹے پراپنے کپڑے رکھے ۔وہ صومان کے بستر پر اس وقت تک نہیں بیٹھتی تھی جب تک کہ وہ اسے بیٹھنے کو نہیں کہتا ،یااس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچ نہیں لیتا۔اس نے کبھی صومان کی نظرونسے نظریں ملا کر بات نہیں کی۔لیکن اس دن اس سے ایک غلطی ہوگئی

قوسیہ پہلے ماہ کے دو دن بیٹی کے ساتھ بنگلور میں گزارتی تھی اور دوسرے ماہ کے دو دن شوہر اور بیٹے کے ساتھ کلکتہ میں۔ وہ جب بھی کلکتہ آتی بڑی باریک بینی سے عبیدہ کی جانچ پرکھ کرتی۔اس پر کڑی نگاہ رکھتی ۔اسے ٹھونک بجاکر دیکھتی۔لیکن کبھی اس کے ہاتھ کوئی ایساسراغ نہ لگا ،جس سے اس کا دل کھٹک جاتا۔اوروہ آسودہ خاطر اطمینان کی سانس لےتی ہوئی واپس کوئمبٹورچلی جاتی۔ ڈیڑھ سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا ۔ لیکن اس بار قوسیہ کلکتہ نہیں آ سکی تھی۔اس کے آفس میں آڈٹ کاکام چل رہا تھا ۔ مرکزی دفتر سے ایم ڈی صاحب بھی حاضر ہوگئے تھے۔ اسے دن کو آڈٹ پارٹی کے سوالوں کے جواب دینے پڑتے تھے اور رات کو ایمڈی صاحب کی آسائش کا خیال رکھنا پڑتاتھا !! بہرحال وجہ کچھ بھی ہو ، حقیقت یہ تھی کہ وہ اس بار گھر نہیں آ پائی تھی۔

ہاں ، تو میں یہ بتا رہا تھا کہ سخت احتیاط برتنے کے باجود اس دن عبیدہ سے ایک غلطی سرزد ہوگئی۔ وہ رات کو صومان کے کمرے میں یہ کہتے ہوئے داخل ہوئی ،“اُف ، آج تو سرحان سونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ بڑی مشکل سے سلایاہے ۔“

صومان نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کو کہا۔اور جب اس نے صومان کے کان سے موبائل چپکا ہوا دیکھا تووہ سٹپٹاگئی۔ اس کے بھی پاوں تلے کی

زمین نکل گئی ۔ رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے ۔ صومان موبائل پر قوسیہ سے باتیں کررہا تھا ۔ قوسیہ نے موبائل پر عبیدہ کی آواز سنی تو اس کی چھٹی حس جاگ اٹھی ۔ اس نے جھنجلاکر پوچھا ، " اتنی رات گئے عبیدہ آپ کے کمرے مینکیاکرنے آئی ہے ؟"

صومان سے خاطر خواہ جواب نہ بن پڑا ۔وہ اس کی آئینبائیں سے مطمئن نہیں ہوئی ۔دوسرے ہی دن کلکتہ آدھمکی ۔ سامان ایک طرف پٹکا ، دندناتی ہوئی اندر کمرے میں گئی اورہتھنی کی طرح چنگھاڑنے لگی ،"آپ کو شرم نہیں آتی ۔آپ نے میری وفاداری کا یہ صلہ دیا ۔ ایک نوکرانی کے ساتھ چھی "!!

اور پھر گھائل شیرنی کی طرح ادھر ادھر نظریں دوڑاتی ہوئی گرجنے لگی ،'' کہاں گئی ، وہ حرام زادی ! "

اور جب وہ دھاڑتی ہوئی کمرے سے باہر آئی ،تو دیکھاعبیدہ ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی ہوئی ہے ۔قوسیہ نے ڈپٹ کر کہا ،"میری غیر موجودگی میں تونے خوب گل کھلایا ۔ جس تھالی میں کھایا ، اسی میں چھید کیا ۔تجھے ذرالاج نہیں آئی ۔چھی چھی چھی!چلّو بھر پانی میں ڈوب مر"!!

عبیدہ فرش پر نظریں گڑائے خاموش بیٹھی رہی ۔ٹس سے مس نہ ہوئی ۔

"کیوں ،اب بولتی کیوں نہیں ؟ " قوسیہ لفظوں کے تیر چھوڑ تی گئی ،" کم بختی کی ماری!! میں تجھ پر بھروسہ کر کے گئی اورتو میری ہی چھاتی پر مونگ دلنے لگی ۔ میری جگہ لینا چاہتی ہے!!چھی چھی" !!!

عبیدہ کے صبر کاپیمانہ لبریز ہونے لگاتھا ۔اس نے دبے لہجے میں کہا ،"نہیں ،ہم آپ کی جگہ کیسے لے سکتے ہیں ؟ ہمیناپنی اوقات معلوم ہے ۔ "

"چپ مردود ،زبان لڑاتی ہے ! "قوسیہ نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا ،"نمک حرام کہیں کی ۔ "

’نمک حرام‘ کا لفظ سنتے ہی عبیدہ بپھرکراٹھی ، ساڑی کا پلّو پیچھے سے گھماکر سامنے پیٹ کے پاس اُڑس لیااورقوسیہ کے روبروکھڑی ہوگئی ۔ نظروں سے نظریں ملا کربولی ، ”ہم نمک حرام نہیں ہیں !نہ ہی آپ کا بھروسہ توڑا ہے ۔ہاں ،ایک غلطی کی ہے ہم نے ۔ایک شریف مردکی عزت بچائی ،اسے بازاری عورتوں کے پاس جانے سے روکے رکھا ۔ بس یہی ہمارا قصور ہے ۔مگر یقین کیجئے ، ہم نے یہ کام مفت نہیں کیا ۔ پیسے لیے ہیں ۔ہم بھی ماں ہیں ۔ ہمارے بچوں کی بھی ضرورتیں ہیں ۔ کھانا کپڑا ، پڑھائی لکھائی ۔ دن بدن خرچ بڑھتا جارہاہے ! مہنگائی کتنی بڑھ گئی ہے ۔آپ بھی توسمجھتی ہیں“!!

دفعتاً قوسیہ کے کان کے پردے پر لفظ ’بھی‘ جیسے چپک گیا ۔ اور جب اس نے عبیدہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھاتو جسم لرز اٹھا ۔

اسے عبیدہ کی پتلیوں پر اپنا عکس نظر آنے لگاتھا !! اوریہ محسوس ہونے لگاتھا ، عبیدہ کی نظریں اس کے پائینچے کی طرف بڑھتی چلی آرہی ہےں !!!

* * *

(آجکل ،ستمبر2009ء نیاورق ،بمبئی ،2009 ،شمارہ :٢٣)

بِسرجن

وہ پارک میں بیٹھامونگ پھلی چبارہاتھا ! انگلیوں کی انگوٹھیاں نچا رہا تھا!!

انٹریودینے جب کبھی کلکتہ آتاتوشام کواس پبلک پارک میں چلاآتااور باونڈری وال پر بیٹھ کر ہوڑہ پل ، ودّیا ساگر سیتو ،آتی جاتی کشتیوں اور لہروں کوتکتارہتا۔کبھی لمبی لمبی سانسیں کھینچ کھینچ کر بھستریکا ،کبھی چھوٹی چھوٹی سانسیں باہرنکال نکال کر کپال بھاتی اور کبھی ناک کے سوراخوں کو دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے باری باری دبادباکرانلوم بلوم کرتا۔اور جب ان پرنایموں سے فارغ ہوجاتا توجیب سے ٹھونگا نکال کر مونگ پھلی چباتااور رہ رہ کر انگوٹھیاں نچاتا۔

اس روز بھی وہ یہی کررہاتھاکہ یکایک بوڑھا نمودار ہوا ،گیروے رنگ کا جبّہ اور گلے میں ردراکش کی مالائیں پہنے۔ ڈنڈے کومڑوڑ کر سانپ کی طرح بل دیتا ہوا اس کی جانب بڑھنے لگا۔ قریب آیااور اس کے کندھے پرہاتھ رکھ کر پوچھا ،’’انٹریو ہوگیا ؟‘‘

وہ چونک پڑا۔ مڑکردیکھا ،''آپ !آپ یہاں!! آپ کو تو میں نے... "

اندرنیل ذہن پر دباوڈالنے لگا اور پھر بولا ،"ہاں ہاں! حسن آباد ، حسن آباد اسٹیشن پر ، اورکئی مرتبہ اچھّامتی کے کنارے بھی دیکھاہے۔"

اس کے بعد اس نے گمبھیر لہجے میں پوچھا ،"لیکن آپ یہاں ؟اس وقت ؟ "

"میں یہاں! وہاں!!جب جہاں ، تب وہاں !!پرنتو تو نے بتایا نہیں ۔انٹریو ہوگیا ؟" بوڑھے نے اپنا سوال دہرایا۔

"ہاں! لیکن آپ کو کیسے پتا کہ میں انٹریودینے آیاتھا ؟"

بوڑھے نے آنکھ میچتے ہوئے کہا ،"مجھے سب پتاہے ! سب کچھ!!بھوت ، بھَوِش سب!!! "

"اور برتمان ؟"

"ارے مورکھ !سمے کاچکربہت تیز گھومتاہے!!"وہ پیشانی پر بل ڈال کر بولا ، ''اتنا تیز کہ اس میں ورتمان کا کوئی استھان نہیں !!!تیرابھَوِش اجوّل ہے ،بس ایک بادھا ہے۔"

"بادھا!کیسی بادھا ؟" اندرنیل کے چہرے پر مسکراہٹ سکڑنے لگی۔

"ہاں ،بادھا ہے ۔ایک بادھا ہے۔" بوڑھے نے ڈنڈا زمین پرٹھونک کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں توہرروز اخبار میں اپنی راسی ملاتاہوں۔آج بھی ملائی ہے۔مجھے تو کوئی بادھاوادھانظرنہیں آئی۔"

"راسی ملانے سے کچھ نہیں ہوتا۔یدی راسی کاسمبندھ بھاگ سے ہوتاتو ایک ہی دن جنم لینے والے لاکھوں لوگوں کے بھاگ ایک جیسے ہوتے۔چھوڑ ان باتوں کو۔ میں کہتا ہوں ، ایک بادھاہے ،توبادھاہے۔"

"بادھا ، ہونہہ !"اس نے پیشانی پربل دیتے ہوئے کہا ،''کیسی بادھا ؟"

بوڑھے نے کہا ،'' اپرادھ کی بادھا۔ "

"اپرادھ کی بادھا"!!

"ہاں ،اپرادھ کی بادھا ! !اور جب تک یہ بادھا دور نہیں ہوگی ، توروزگارنہیں کر سکتا!!''

"لیکن اپرادھ کاروزگارسے کیاسمبندھ ؟''اندرنیل نے حیرت سے پوچھا۔

بوڑھے نے ندی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ،''ندی کا سمبندھ سمندر سے ہے ،سمندر کابادل سے۔ اوربادل کابارش سے۔اس لیے بارش کا سمبندھ ندی اور سمندرسے ہے۔ہربستو کا ہربستو سے سمبندھ ہے!!'' اتنا کہہ کر بوڑھا مسکرایا ، سانپ نماڈنڈے سے اس کی پیشانی کی طرف اشارہ کیا اورتیزگامی سے جانے لگا۔

اندرنیل تعجب سے اسے تکتا رہا!!دوچار قدم چلنے کے بعد بوڑھا رکا۔ گردن کو خم دے کربولا ، ''اور ہاں!سن ،آج رات کو ہلسا سنبھل کر کھانا ،کانٹا چبھنے کی سمبھاونا ہے !!''یہ کہہ کربوڑھا چلاگیا۔

اس دن اندرنیل پارک میں دیرتک گم صم بیٹھارہا۔ایساگم صم کہ چکرریل کی آخری ٹرین کب چلی گئی اسے خبر ہی نہ ہوئی ۔

-دو-

تری دیب بابو بارسوخ آدمی ہیں ۔ سیاست اورباگدہ پالن ان کا خاص مشغلہ ہے ۔ پنچائت سمیتی کے سبھا پتی ہیں ۔ پارٹی نے یقین دلایاہے ۔ اگر ضلع پریشد پر قبضہ ہوا تو اس بار سبھادی پتی بنادیئے جائیں گے ۔اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ اگر ان کا بیٹا کاروبار سنبھال لے تو وہ آئندہ الیکشن میں اپنی پوری قوت جھونک دیں گے ۔لیکن اندرنیل عجب لڑکا ہے ۔ اسے سیاست سے سروکار ہے ،نہ کاروبار میں دلچسپی!! اپنی قسمت خود بنانا چاہتا ہے ۔ خود سے اپنے پیروں پر کھڑا ہو نا چاہتاہے ۔نوکری کرناچاہتاہے ۔درجنوں انٹریو دے چکاہے ۔ اس باربھی ایک انٹریو دے کر پارک میں بیٹھا مونگ پھلی چبارہاتھاکہ بوڑھا پھر وارد ہوا!بولا ،''کہاتھانا ،جب تک بادھا دور نہیں ہوگی ، تو روزگارنہیں کرسکتا!! انٹریوونٹریو سے کوئی لابھ نہیں! !''

”اپرادھ ! ایک اپرادھ ،اور پھرسکھ ہی سکھ !آنند ہی آنند!!یہ کہہ کر بوڑھا جانے لگا ۔ لیکن جاتے جاتے مڑااوربولا ،“ سر سنبھال کے رکھنا ، چوٹ لگنے کی سمبھاوناہے !!” اور پھر تیزتیز قدموں سے چلتا ہوا جھاڑیوں میں گم ہوگیا!!

بوڑھے کو دوسری بار دیکھ کر اندرنیل حواس باختہ ہوگیا۔اس دن بھی اسے تعجب ہوا تھا ، جب رات کے کھانے میں اس نے ہلسامچھلی دیکھی تھی ،اور کھاتے وقت کانٹا اس کے مسوڑے میں چبھ گیاتھا۔ وہ درد سے کرہا اٹھا تھا۔ماں نے ساری کاآنچل اس کے منہ میں ڈال کربڑی احتیاط سے کانٹا نکالاتھا۔خون بھی نکل آیا تھا۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہاتھا کہ ٹرین کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ آخری لوکل تھی۔ وہ اسٹیشن کی طرف پکا ۔ ٹرین سرسراتی ہوئی پلیٹ فارم سے نکلتی جارہی تھی ۔ اس نے دوڑ لگائی اور کسی طرح ٹرین مینسوار ہوگیا ۔ دروازے کے پاس سے ایک شخص کندھے پر دودھ کا کنستر لیے گزر رہا تھا ۔ گاڑی نے خاصی رفتار پکڑلی

تھی ۔ اندرنیل خود کو سنبھال نہ سکا اور کنستر والے سے جاٹکرایا ۔ دم بھی نہیں لے پایا تھاکہ سامنے بیٹھے شخص نے کہا ، '' بھائی ، پیشانی سے خون بہہ رہاہے!! ''

اندرنیل نے جھٹ سے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پیشانی پر پھیری ۔ دیکھا ،خون کا دھبہ ہے ۔ دوسرے ہی لمحہ بوڑھے کی آواز اس کے کانوں میں گونج اٹھی ،''سر سنبھال کر رکھنا ۔ چوٹ لگنے کی سمبھاونا ہے!!"

"توکیا اب اپرادھ !''وہ سہم گیا!!ایک انجانے خوف نے اسے آگھیرا ۔ اس کے بعد اندرنیل میں تبدیلی آتی گئی ۔اب اس نے نوکری کے لیے درخواست دینی بند کر دی ۔ ساراسارا دن اِدھر اُدھر سرگرداں پھرنے لگا ۔کھسیاتا ہوا ، بدبداتا ہوا ،"اپرادھ! ایک اپرادھ ، اور پھرسکھ ہی سکھ !آنند ہی آنند!!'' اور سوچنے لگا کیسے روز گار کی راہ میں حائل وہ رکاوٹ جلد سے جلد دور ہوجائے ۔

ایک دن رات کے ایک بجے وہ چوراہے پرجاپہنچا ۔ خبطی کی طرح چکرلگانے لگا ۔ نائٹ پٹرولینگ دستے نے اس حال میں دیکھاتوا سے گھر جانے کو کہا ۔ لیکن وہ راضی نہ ہوا ۔کہنے لگا ، ''مجھے گرفتار کرلو!اتنی رات گئے چوراہے پر اس طرح پھرنا کیا اپرادھ نہیں ؟ میں نے اپرادھ کیا ہے ۔ گرفتار کرلو مجھے ۔"

انسپکٹر نے پہچان لیاکہ سبھاپتی کابیٹا ہے ۔ اس نے التجاکی ،'' اندرنیل بابو ، جیپ میں بیٹھیے ، آپ کو گھر چھوڑ دیتاہوں ۔"

لیکن اندرنیل بضد تھا ، کہتا جارہا تھا ،''میں نے اپرادھ کیا ہے ! گرفتارکرلو مجھے!!''

اس روز پولس والے اسے بزور گاڑی میں بیٹھاکرگھر لے آئے ۔گاڑی کی آواز سن کر ماں دوڑی باہر آئی ۔تری دیب بابو بھی پیچھے پیچھے نکلے ۔ انسپکٹر نے سارا ماجرا

سنایا۔ ماں نے لپک کربیٹے کو سینے سے لگالیا۔سسک کر بولی ،''کیاہوا
بیٹا ؟کیاہواندو ؟ کہاں چلا گیا تھا ، میرا لال ۔"

تری دیب بابونے بیوی کو ڈانٹ پلائی ،"تمہارے اسی لارڈ پیار نے اس کا دماغ خراب کردیاہے۔'' اتنا کہہ کر انھوں نے دھوتی کا کونچا مٹھی میں دبایا اور پھنپھناتے ہوئے اندر چلے گئے۔

۔تین۔

اوردوسرے دن اندرنیل اچھّامتی کے کنارے دیوانہ وار پھر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں کیا آیا کہ اس نے اچانک ندی میں چھلانگ لگا دی۔ تیرتاہوا اُس پار جانے لگا۔ اچھّا متی ندی کے اس پار بنگلہ دیش ہے ۔ چنانچہ بی ایس ایف کے جوان فوراً حرکت میں آگئے۔ کشتی لے کر دوڑ پڑے ۔ اسے کھینچ کرباہر نکالا۔ایک جوان نے کہا ، ''ارے ،یہ تو سبھاپتی جی کے سپتر ہیں"!

اندرنیل پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا ،'' ندی پار کرنااپرادھ ہے ۔ میں نے اپرادھ کیاہے۔ مجھے گرفتارکرو ۔ مجھے گرفتارکرو"

اور اس بار بیایسایفوالے اسے گھر چھوڑنے آئے۔ تری دیب بابو سے کہا ،" سبھاپتی جی ،لگتا ہے ان کی مانسک حالت ٹھیک نہیں۔ آپ سے بنتی ہے۔ انھیں ندی کنارے جانے نہ دیں۔ آتنک واد کے خلاف مہم تیزہے۔چوکسی بڑھادی گئی ہے۔گولی چلادینے کاآرڈر ہے ۔"

بیایسایفوالے جاچکے تھے ،لیکن تری دیب بابواپنی جگہ کھڑے رہے ۔منہ پھاڑے !بت بنے!!ماں اوربیٹے کو گھورتے رہے !!

اور ایک دن اندرنیل نہرکے اس پار چلاگیا۔ہاں ، آبادی کی دوسری جانب ایک نہر ہے ،اورنہر کے اس پار ایک کشادہ میدان ،جہاں ہر بدھ کو ہاٹ لگاکرتاہے۔

اس روز بھی بدھ تھا ۔وہ ہاٹ میں سارادن سرافگندہ پھرتارہا ۔ دکانداروں کو دھمکاتارہا ۔ خریداروں سے الجھتارہا ۔ ہر کوئی اس کے باپ کی پوزیشن کاخیال رکھ کر غصہ پی جاتا ۔اس کے پاگل پن کو نظرانداز کردیتا ۔اور جب وہ شام کو لوٹ رہاتھا تو اس کی نگاہ فوڈ انسپکٹر پر پڑی ۔اسی پنچائت سمیتی کے دفتر میں اس کی پوسٹنگ تھی ۔وہ بھی اسی ناوپر سوار تھا ۔ اسے دیکھتے ہی اندرنیل بدبدایا ، ’’اپرادھ! ایک اپرادھ ،اور پھرسکھ ہی سکھ !آنند ہی آنند!!‘‘ اوراس نے بے چارے انسپکٹر کے گال پر ایک طمانچہ جڑدیا ۔ ناومیں کھلبلی مچ گئی ۔ بات تھانے دار تک پہنچ گئی ۔ تھانے دار نے تری دیب بابو سے دھیمے لہجے میں کہا ،’’سر ،وہ سرکاری ملازم ہے ۔ شکایت بی ڈی او نے فارورڈ کردی ،تو آپ جانتے ہی ہیں ،میں بھی سرکاری ملازم ہوں اور سر ،یہ اندرنیل بابو کو ہوا کیا ہے ؟ دن بھر ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں ؟ آئے دن کچھ نہ کچھ کر بیٹھتے ہیں ۔ انہیں کسی ڈاکٹر کو... ‘‘

تری دیب بابو نے تھانے دار کوترچھی نگاہوں سے گھورا ۔ تھانے دار کی زبان لڑکھڑا گئی ، ’’سر ،میرا مطلب ہے !سر ، آپ تو جانتے ہیں ۔‘‘

”اوسی صاحب ، میں جانتاہوں ،مجھے کیاکرناہے ۔آپ جایئے ، اپناکام کیجئے ۔‘‘ اورتری دیب بابو پیشانی پر بل دے کرتھوڑی دیر کچھ سوچتے رہے ،پھراوپر نیچے سر ہلاتے ہوئے بڑبڑانے لگے ،’’ہاں ، اب کچھ کرنا ہی ہوگا!‘‘

دوسرے دن بیوی کے کان مینکچھ کہااور بستر پر پھیل گئے ۔

ماں منہ بسور کر بیٹے سے بولی ،’’اندو ، تیرے بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ۔ ڈاکٹر نے آرام کرنے کو کہاہے ۔لیکن انہیں کون سمجھائے ۔ ضد کر رہے ہیں ، گھیری پر جانے کو ۔ کہہ رہے ہیں ، ’کل پرنیماہے اورابھی تک جھانکا (بانس کے تراشے سے بنا پنجرانماپھندا) نہیں ڈالا گیا ۔ پارٹی کا فون پر فون آرہاہے ۔اگرآج رات سے جھانکا نہیں ڈالاگیا تو باگدہ مچھلیاں مر جائیں گی ۔نقصان تونقصان ، مارکٹ میں بدنامی بھی

بہت ہوگی۔ اس لیے اب مجھے ہی گھیری پر جانا ہوگا ۔ تو بابا کے کمرے میں سوجانا ۔ انہیں وقت سے دوا ئیں دیتے رہنا ، دیکھ ، یہ گولی اوریہ سیرپ "

ماں کی بات پوری بھی نہیں ہوپائی تھی کہ اندرنیل نے چونک کرکہا ،"تو گھیری پر جائے گی!وہ بھی رات کو!!"

"تو بتا کیا کروں!! کون جائے گا ؟بول !"

اندرنیل تھوڑی دیر خاموش کھڑا نیم وا آنکھوں سے ماں کا چہرہ تکتا رہا۔ پھر دھیرے سے بولا ،" ٹھیک ہے !میں چلاجاوں گا!!"

-چار-

اس روزاندرنیل رات کوگھیری پرگیا۔کمپنی کی دو ائرکنڈیشن وین پہلے ہی پہنچ چکی تھیں۔ہر جھانکے میں دس کلو ،بارہ کلو باگدائیں پکڑی اور وین پر لادی جارہی تھیں ۔ صبح صادق تک یہ سلسلہ چلتارہا۔ساڑھے چھ ٹن سے زیادہ باگدائیں پکڑی گئیں۔کمپنی والوں نے بائیس لاکھ روپے نقداندرنیل کے حوالے کئے۔اندرنیل بانس کے پل سے ہوتا ہوا مچان پر چڑھ گیا۔روپے کی تھیلی کھولی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اتنے ڈھیر سارے روپے ایک ساتھ اس نے کبھی دیکھے نہ تھے۔پانچ پانچ سواورہزارہزارکے کرارے کرارے نوٹوں کے پلندے ! وہ انھیں دیر تک گنتارہا! کبھی جلدی جلدی اورکبھی ٹھہر ٹھہر کر!!

گھر لوٹ کر جب اس نے روپے کی تھیلی ماں باپ کے سامنے رکھی ، تو انھوں نے بیٹے میں خوش آئند تبدیلی محسوس کی۔ ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی!!تیر نشانے پر لگ چکا تھا۔

دوسرے دن بھی اندرنیل گھیری پر پہنچا ۔لاکھوں کی باگدائیں پکڑیں اور فروخت کی گئیں ۔اندرنیل نے اسی طرح مچان پر بیٹھ کردیر تک روپے گنے ،اور تھیلی چھاتی سے چمٹائے گھرآیا ۔

یہ سلسلہ پانچ دنوں تک چلتا رہا ۔ چھٹے دن اندرنیل نے تری دیب بابو سے کہا ،''بابوجی ،کیوں نا ، ہم کھال (نہر)کے اس پار والے کھیت کو بھی گھیری میں بدل کر باگدہ پالن کریں ؟''

کاروبار مینبیٹے کی دل چسپی دیکھ کر تری دیب بابو پھولے نہ سمائے ۔کہنے لگے ، ''واہ ! تو نے تو میرے منہ کی بات چھین لی ۔ کئی دنوں سے میں بھی یہی سوچ رہا تھا ۔ ایک کام کر ، میری وہ اٹیچی لا ۔''

اورتری دیب بابو اٹیچی سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کر بیٹے کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے ،''دیکھ یہ ان کسانوں کی لسٹ ہے ،جن کی زمینیں ہمارے کھیت کے آس پاس ہیں ۔انھیں سرکار نے زمینیں کاشتکاری کے لیے دی ہیں ۔تو ایک کام کر ان لوگوں کی ایک کواپرٹیو بنا ۔ میں تجھے اس کا چیئر مین بنادوں گا ۔''

اوردیکھتے دیکھتے کواپرٹیو تیارہوگئی ۔تقریباًڈیڑھ سو بیگھا زمین یکجاکی گئی ۔کمر تک گہری مٹی کھود کر اینٹ بھٹوں کوبیچی گئی ۔جو پیسے حاصل ہوئے ان سے زمین کے ایک کونے میں کنکریٹ کے تین پروسیسنگ ٹینک بنائے گئے ، اورنہر سے پانی کھینچنے کے لیے ڈیزل پمپ سیٹ خریدے گئے ۔جن کسانوں کی زمینیں لی گئی تھیں ان سبھوں کو سستی مزدوری پر باگدہ پالن کے کام میں جوت دیاگیا ۔ ٹینکوں میں پن (باگدہ کے انڈے) کی دیکھ بھال ہو ،یاہر دس دن بعد ایک سے دوسرے ٹینک میں ان کی تبدیلی ۔ فِڈ اور دوائیں دینے کی ذمہ داری ہو یا انھیں گھیری میں منتقل کر کے رات رات بھر بانس کے مچان پر بیٹھ کر پہرہ دینے کا کام ۔ ہر کام کے عوض روزانہ ستّر ، اسّی روپے محنتانہ طے تھا ۔کسان بھی خوش تھے ۔ زمین تو

انھیںمفت مینملی تھی۔اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پردھان ، پارٹ بوکرآخر انھیں ملتا بھی کیاتھا۔اور پھر تری دیب منڈل جیسے نیتاوں سے وابستگی تو اپنے آپ میں ان کے لیے ایک قابلِ رشک بات تھی۔غرض یہ کہ چند ہی مہینوں میں نئی گھیری باگدہ پالن کے لیے تیار ہوگئی۔ اور بھلا ہوتی بھی کیوں نہیں ،اچھامتی ندی سے نکلنے والی اس نہر کا پانی ویسے تو میٹھا ہے ، لیکن جب ندی میں جوار آجاتاہے اور سندر بن کے راستے خلیج بنگال کانمکین پانی اس میں بھر جاتا ہے تو یہ نہر میٹھے اور نمکین پانی کا آمیزہ بن جاتی ہے۔اس آمیزہ مینباگدائیں خوب پھلتی پھولتی ہیں۔عام دنوں میں جھینگا مچھلی کی یہ نسل کیچڑ مٹی میں دبی بیٹھی رہتی ہے ،مگر جب چاندکی روشنی فضامیں پھیلتی ہے ، تویہ کیچڑ سے نکل کرسطحِ آب پر آجاتی ہے۔ اندرنیل کی اس نئی گھیری میں بھی اب باگدائیں سطحِ آب پرآنے لگی تھیں۔ چنانچہ جال پھینکے گئے ۔ ٹنوں باگدائیں پکڑی گئیں۔چار رات تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔

آج پانچویں رات تھی۔ رات بھر جال ڈالنے ، باگدہ پکڑنے ، وزن کرنے اور وین پرلادنے کاکام چلتارہا۔

-پانچ-

پوپھٹ چکی تھی۔ فضامیں ہلکی ہلکی روشنی پھیل گئی تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ سے پوراماحول گونج اٹھاتھا۔ کمپنی والے روپوں سے بھری تھیلی اندرنیل کودے کر چلے گئے تھے ۔ مزدوروں کی ٹولی بھی جاچکی تھی۔پہرہ دار مچان پر بیٹھے اونگھنے لگے تھے۔گھیری کی تہ سے اٹھنے والی بدبوشمال مشرق سے آنے والی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواوں میں تحلیل ہورہی تھی ۔ رات بھر کے کام سے پگڈنڈیانکیچڑ آلود ہوچکی تھیں۔اندرنیل چھاتی سے روپوں کی تھیلی چمٹائے پگڈنڈیوں پرپیر جما جماکرسڑک کی جانب بڑھتا جارہاتھاکہ کسی نے اچانک اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ

دیا۔ وہ چونک پڑا !! مڑ کر دیکھا ۔سامنے بوڑھاکھڑاتھا ،اپنے مخصوص بھیس میں۔
اندرنیل نے بوڑھے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا ، ''آپ ، یہاں! اس وقت" !!

"میں یہاں! وہاں!!جب جہاں ، تب وہاں !!!'' بوڑھے نے پتلیاں نچاتے ہوئے کہا ،''اپرادھ ! ایک اپرادھ ،اور پھرسکھ ہی سکھ ! آنند ہی آنند!!''

"لیکن آپ کی بات تو جھوٹ نکلی۔دیکھئے ،بنا کوئی اپرادھ کیے ہی مجھے کتنا اچھا روزگارمل گیاہے ،لاکھوں روپے کمانے کا!'' اندرنیل نے روپے کی تھیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بوڑھے نے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ سجائی اور گردن کو جنبش دیتے ہوئے کہا ، ''اچھا! سچ مچ ،تونے کوئی اپرادھ نہیں کیا ؟"

اندرنیل نے چھاتی تان کر کہا ،'' نہیں میں نے کوئی اپرادھ نہیں کیا۔"

بوڑھا لمحہ بھر خاموش کھڑا رہا اورپھرڈنڈا نچا کربولا ، ''اپجاوزمین پر باگدہ پالن اپرادھ نہیں ؟"

"باگدہ پالن اپرادھ!!'' اندرنیل بدبدایا۔بوڑھے نے آنکھیں موند لیں اور دھیمے لہجے میں کہنے لگا ، " ہاں ، اپرادھ ہے ، گھور اپرادھ۔ اس کے علاوہ بھی تونے کئی اپرادھ !! ''

اس نے اپنی بات پوری بھی نہ کی تھی کہ اندرنیل نے گھٹنوں کے درمیان روپے کی تھیلی دبائی ،جسم کا اوپری حصہ موڑکر دونوں ہاتھوں سے بوڑھے کی گردن دبوچ لی۔ پوری طاقت سے کھینچا اور گھیری میں پھینک دیا۔

" چھپاک !''سے ایک آواز ابھری ، اور دوسرے ہی لمحہ فضامیں خاموشی چھا گئی۔

پانی کی سطح پر بننے والا دائرہ رفتہ رفتہ آنکھوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا !!

* * *

(ذہن جدید ،نئی دہلی ،مارچ تا اگست2008)

پاروتی سے پارو تک

جنگلی بھینسا ڈکرایا۔ زور سے زمین پر پاوں مارکر خاک اڑائی۔ لیکن وہ ڈری نہیں ۔ ڈرتی کیسے ، وہ کوئی معمولی عورت نہیں۔کالے پہاڑ جیساوہ وحشی بھی معمولی بھینسا نہیں ۔ سینگ کی نوک سے دنیا کو زیروزبر کرنے کی قوت رکھتاہے ۔ تمام توانائی سمیٹ کر اس کی طرف لپکا۔ پاروتی پھر بھی نہیں گھبرائی۔ داوکے دستے پر گرفت مضبوط کی اور ڈٹی رہی۔ اس وحشی نے پاروتی کے پیٹ میں سینگ داخل کرنے کے لیے جوں ہی اپناسر جھکا یا ، پاروتی نے کھچاک سے ایک ہی وار میں اس کاکام تمام کردیا۔ بھینسے کاسر دھم سے پاروتی کے قدموں میں آگرا۔

اور وہ چونک کر جاگ اٹھی۔ پاس لیٹا ہوا گاہک اچانک کھڑا ہوگیا۔ گھبراکر پوچھنے لگا ،''کیاہوا"!

"کچھ نہیں ۔'' اس نے دیوار پر ٹنگی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی۔رات کے دو بج رہے تھے۔ ''ہوگیا ؟"

"کیا!'' گاہک اب بھی ہکا بکا کھڑاتھا۔

”میرامطلب ہے آپ اپناکام کرچکے ؟ اگر باقی ہے تو آئیے ۔ جلدی سے کر لیجیے ۔ آپ کا وقت پورا ہوچلاہے ۔جلدی کیجیے ۔ وہ دوسرے گاہک کو لے کرآتاہوگا ۔“ پاروتی پلنگ پر لیٹے لیٹے بے دلی سے بولی ۔

شمالی کلکتے میں بسے اس علاقے کا نام سوناگاچھی ہے ، جو کبھی ثنااللہ غازی کے نام سے جانا جاتا تھا ۔ یہاں ایک بازار لگتا ہے ،حسن کا بازار ، جس کی رونق کبھی ماند نہیں پڑتی ۔ تہوار کے موقعوں پر تو یہاں کی رونق کو چارچاند لگ جاتے ہیں ۔ اور درگاپوجا توبنگال کاسب سے اہم تہوار ہے ۔اس موقعہ پر یہاں جسم فروشی کاکاروبار پورے شباب پر رہتا ہے ۔ صبح تک خریداروں کی ریل پیل رہتی ہے ۔دور دراز علاقوں سے جسم فروشی کے اسباب مہیا کیے جاتے ہیں ۔ نابالغ سے لے کر ادھیڑ عمروالی تک ، کیاکچھ نہیں ملتاہے! باربی ڈالز کی طرح شوکیس میں سجی نوعمر لڑکیاں ہمہ وقت تیاررہتی ہیں ۔بس کرارے کرارے نوٹ گنّے کی دیر ہے!! کم قیمت والیاں بھی حاضر خدمت رہتی ہیں ۔کیل کانٹوں سے لیس گلیوں کے نکّڑ وں میں ، کوٹھوں کے برآمدوں پر ، بنددکانوں کے چھجوں کے نیچے قطار باندھے اپنی جلوہ گری کا مظاہرہ کرتی ہوئیں ۔اورآج تومہاا شٹمی ہے ۔ درگاپوجا کی اہم ترین رات ۔ لیکن پاروتی نے پہلے ہی سے من بنارکھاتھا ۔ وہ اس مہااشٹمی کو دھندے پر نہیں بیٹھے گی ۔ پوجا گھومنے جائے گی ۔

بچپن میں پاروتی کے دل میں یہ خواہش انگڑائیاں لیاکرتی تھی کہ وہ مہااشٹمی کی رات کلکتہ کے منڈپوں میں جائے ۔ وہاں کی آرائش و زیبائش سے لطف اندوز ہو ۔ ماں درگاکا درشن کرے ۔ رنگ اورروشنی میں ڈوبے ہوئے اس شہرکادل کش نظارہ دیکھے ۔ قسم قسم کی چاٹ کھائے ،طرح طرح کے کھلونے خریدے ۔ وہ ہر سال اپنے باپو سے ضد کیا کرتی تھی کہ وہ اسے مہااشٹمی کے روزشہر گھمانے لے جائے ۔ لیکن اس کے باپوکو تاڑی پینے سے فرصت کہاں تھی!وہ مہا اشٹمی کے روز تو

دوپہر ہی سے مٹکا لے کر بیٹھ جاتاتھا ۔اور ماں کی موت کے بعد تو پاروتی خانگی جھمیلوں میں ایسی الجھی کہ چھوٹی سی عمرمیں ہی زندگی کی تمام رعنائیاں اوجھل ہو گئیں ۔لیکن جب سے دیب ملا اس کے من میں امید کی ایک کرن پھوٹنے لگی ۔ اسے بھروسہ ہوچلا تھا کہ دیب اس کادامن خوشیوں سے بھر دے گا۔ وہ اسے ماں درگا کی درشن کو ضرورلے جائے گا۔ لیکن پاروتی کا بھروسہ پاش پاش ہوگیا جب اس نے دیکھاکہ دیب بھی بو تلوں میں ڈوب جانے کی تیاریاں کررہا ہے۔ پاروتی خود پر قابو نہ رکھ سکی ۔ جھلّااٹھی ۔ زخمی شیرنی کے مانند ٹوٹ پڑی ، ’’کیوں رے بھڑوے ، کام نہ کاج کا دشمن اناج کا! میری کمائی پر گل چھرّے اڑاتاہے اور میری ہی باتیں اَن سنی کرتاہے۔ حرام خور کہیں کا! دوہفتوں سے کہہ رہی ہوں ،مہااشٹمی کے دن ماں کی درشن کو چلوں گی اور تو ہے کہ ڈھالنے بیٹھ گیا۔ چل اٹھ !‘‘ یہ کہہ کر پاروتی نے دیب کی پیٹھ پر ایک زور دار تھپکی لگائی ۔

دیب پیشہ وردلال تو تھا نہیں کہ خاموشی سے سہہ لیتا ۔ طیش میںآکر ڈپٹ پڑا ، ’’چپ رہ حرامی ،تو مجھے کیا کھلائے گی ؟ تیری اوقات کیا ہے! تو جو بھی ہے میری وجہ سے ہے ،ورنہ تجھے پوچھتاکون ،اس کالے بھینسے کے سوا ؟اس کی رکھیل بن کر زندگی بھر اسی کے اشارے پر ناچتی رہتی۔ یہاں تجھ جیسی رنڈیوں کی کمی ہے کیا ؟ میرا احسان مان کہ تجھے موٹی رقم مل جاتی ہے ۔تیرے پاس شہر کے جتنے بڑے بڑے گاہک آتے ہیں ، سب میری بدولت۔ اگر میں نہ ہوتاتو ماسی اوراس کے دلال تیری بوٹیاں نوچ ڈالتے ۔ اور تو ہے کہ مجھے حرام خورکہتی ہے۔ کمینی ، عورت ذات جو ٹھہری !دغابازکہیں کی!!‘‘

اوردوسرے پل پاروتی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا ۔وہ من ہی من بڑبڑائی ،’’ شاید میں نے اس کی کوئی دکھتی رگ چھیڑ دی ہے ؟ کوئی پرانازخم یاد آگیاہوگا ، ا س لیے وہ پینے بیٹھ گیاتھا ۔اور میں نے اس کے زخم پر مرہم لگانے کے بجائے اس پر نمک

چھڑک دیا ۔لیکن ایسے میں وہ مجھ سے اپنا دکھ بانٹتاکیوں نہیں ؟ صرف تنہائی میں شراب پینے لگتاہے ۔“

اور پھر پاروتی نے عشوہ گری کا سہارا لیا ۔ اسے پیچھے سے جکڑ لیا ۔ شوخ چنچل اداوں سے رجھانے لگی ۔ نخرے بگھارتے ہوئے بولی ،” ناراض ہو گئے کیا ؟ ارے تم تو سچ مچ روٹھ گئے! میں تو مذاق کررہی تھی ۔ لیکن ہاں ، اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے تم پر غصہ نہیں آتاہے ۔ آتاہے ، بہت آتاہے ۔ اتنے دنوں سے تم میرے ساتھ رہتے ہو ،مگر مجھے اس لائق نہیں سمجھتے کہ مجھ سے اپنا دکھ بانٹو ۔پر آج میں نہیں چھوڑنے والی ۔ بتاناہوگا ۔آج ، بتانا ہوگا ۔ تم نے خود کشی کیوں کرنی چاہی تھی ؟بتاونا ،بتاونا ؛ہونہہ“ وہ دیب کی پیٹھ پرہلکے ہلکے مکّے مارنے لگی ۔

سورج ڈھل چکاتھا ۔ مغربی افق پر شفق کی لالی پھیل چکی تھی ۔ہگلی ندی کی جانب سے آنے والی ہوائیں ہلکی ہلکی خنکی کااحساس دلارہی تھیں ۔دیب کے بڑے بڑے گھنگرالے بالوں سے اٹھ کھیلیاں کررہی تھیں ۔ اب پاروتی کو سچ مچ دیب پر پیار آنے لگا تھا ۔ اس نے اسے پوری قوت سے بھینچا ۔لیکن وہ بت بنا کھڑا رہا ۔کھڑکی سے باہر آسمان پر اڑتے ہوئے چھوٹے چھوٹے سنہرے مٹیالے بادلوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا ۔

پاروتی نے کئی بار شرارت سے اس کے کان پر پھونکیں ماریں ؛دانت اور زبان سے کان کی لَو کو چھیڑا ۔ پیٹھ پر گرم گرم سانس کی دھاریں چھوڑیں ، گردن پرتپتے ہونٹ رکھے ۔ لیکن وہ تھا کہ بت کا بت بنا ،افق پر نظریں جمائے کھڑا رہا ۔

مگر پاروتی کب ہار ما ننے والی تھی ۔ اسے جھنجوڑکر بولی ،”دیبو آج تمہیں بتانا ہی ہوگا ۔ مجھے پتہ ہے ، تم اندر سے اتنے سخت نہیں ، جتنے نظر آتے ہو ۔ بتاونا ، کیاہوا تھا ۔“

"سنناچاہتی ہو ؟''دیب نے اپنے جسم کو حرکت نہیں دی ، محض ہونٹ ہلائے ، ''تو سنو۔ اس روز جو ہوا اس کی وجہ بھی عورت تھی۔ چندر مکھی ! چاند کی طرح حسین تھی وہ! بہت پیار کرتا تھااس سے میں۔ بہت پیار کرتا تھا۔"

"چندر مکھی! ''پاروتی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں ،چندر مکھی ، چاند جیسی خوبصورت تھی وہ۔ میری بیوی! "

"کیاہوا ، بے چاری مرگئی ؟''پاروتی نے افسوس ظاہر کرناچاہا ۔

"نہیں ، بھاگ گئی ! میرے ایک دوست کے ساتھ!!''دیب نے فرش پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"اف ،تم جیسے آدمی کو چھوڑکر !کیسی بے وفاتھی!!''

"نہیں وہ بے وفا نہیں تھی۔ وہ عورت تھی بس۔ماں بنناچاہتی تھی۔ بھاگ جانا اس کی مجبوری تھی۔"

"بھلا یہ کوئی مجبوری ہوئی ؟''پاروتی نے زبان کے ساتھ ساتھ ہتھیلیوں کو بھی جنبش دی۔

"ہاں ،وہ مجبور تھی ،اپنے عورت پن کے ہاتھوں!"

"عورت پن کے ہاتھوں مجبور!نہیں وہ بدنصیب تھی ۔ہوس کا شکار ہوگئی ۔ گھر کی عظمت اور شوہر کی محبت کو نہ پہچان سکی۔''پاروتی کی آواز بھرّا گئی۔اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ آنسو کی دو چار بوندیں دیب کے شانے پر بھی ٹپک پڑیں۔

دیب نے مڑ کر دیکھا۔پاروتی نے کپکپاتے ہوئے لہجے میںڈھارس بندھائی ،''تم تومرد ہو! تم کیوں جی چھوٹا کرتے ہو؟ دیکھو ، میری طرف دیکھو ، ''پاروتی نے

خودپرقابوپاتے ہوئے کہا ، ’’تم کیاسمجھتے ہو ، مجھے اپنا جسم بیچنے میں سکھ ملتاہے ؟ میں اس منڈی میں اپنی مرضی سے آئی ؟ لائی گئی ہوں ۔ اپنے باپو کی وجہ سے ۔ اسی کی وجہ سے یہاں ہرروز تل تل مر تی ہوں ۔ ‘‘ پاروتی نے اپنا پرانازخم کریدا ،’’لالٹو کو جنم دے کر ماں چل بسی ۔ میں چھوٹی تھی ۔ باپو دن بھر کھیت میں مزدوری کرتااور رات بھر تاڑی پیتا ۔ میں اپنے ننھے بھیا کی دیکھ بھال کرتی ۔ اب وہی میرا سب کچھ تھا ۔ چھوٹی سی عمر میں چولہا چوکا ، لپائی پوتائی ، تمام کام کیا کرتی تھی ۔“

دیب کو حیرت ہوئی ، ’’یہ کیا ،میری کہانی سننے کے بجائے اس نے اپناقصہ چھیڑ دیا!! لیکن وہ خاموش رہا ۔پاروتی کہتی گئی ،“ لالٹو بڑا نٹ کھٹ تھا ۔ دن بھر دیدی دیدی پکارتا ہوا میرے آگے پیچھے منڈ لاتا رہتا تھا ۔ میں بھی اس پر جان چھڑ کتی تھی ۔ لیکن دو دنوں کے بخار ، صرف دو دنوں کے اس ڈینگو نے میرالالٹو“اس کی آواز سسکیوں میں گم ہوگئی ۔

کچھ دیر تک دونوںچپ رہے ۔ خود کوسنبھال کرپاروتی پھر گویا ہوئی ، “آج وہ اگرہوتا تواٹھارہ سال کاہوتا ۔ تمہاری طرح لمبا تگڑا ہوتا ،میرابھائی!”پاروتی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے ۔

دیب نے پاروتی کو چھاتی سے چمٹاکر تسلی دی ۔آہستہ سے پلنگ پر بٹھا یا ۔ پاروتی نے گفتگو جاری رکھی ، ’’اور ایک دن باپو کو لقوہ مار گیا ۔وید جی نے شہرلے جانے کو کہا ۔ میں باپو کو شہر لے آئی ۔یہاں آئی تو مہیش بابو کی نگاہ مجھ پر پڑی ۔ انھوں نے باپو کو اسپتال میں بھرتی کرایا ۔علاج کی ذمہ داری اپنے سرلے لی ا ور اور اس کے بدلے مجھے یہ قیمت چکانی پڑرہی ہے ۔ وہ مجھے اسپتال کانام نہیں بتاتا ۔ کہتا ہے ، وہ اب بھی میرے باپو کا علاج کروارہاہے ۔‘‘

”تواس سے پوچھتی کیوں نہیں ؟‘‘ دیب نے کہا ۔

"میں نے بہت کوشش کی مگر وہ بتاتاہی نہیں۔اور میں جان کر کروں گی بھی کیا ؟ باپو کے سامنے جاوں گی کس منہ سے ؟اور ویسے بھی بیٹی کوجوان دیکھ کر ماں باپ کو فکر ہو جاتی ہے ، اس کی شادی کی۔"

پاروتی نے گاوتکیہ اپنی گود میں رکھا ، اس پر کہنیانٹیکیں اور ہتھیلیوں سے رخسار تھام کر کہا ،''میری شادی توہوئی نہیں پر دلہن ہر دن بنتی ہوں۔ہر روز مانگ سجاتی ہوں۔ نئے نئے دولہوں کے ساتھ سیج چڑھتی ہوں۔ سسرال جانا ہم جیسوں کے نصیب میں کہاں ؟ آسِن کے اسی مہینے مینششٹی کے دن ماں درگا سسرال سے میکے آتی ہے۔ میرا تو میکا بھی نہیں! میکے میں مہا اشٹمی کے دن دھوم دھام سے ماں کی پوجا ہوتی ہے۔ سَندھی پوجا۔سنا ہے اس وقت ماں کے چہرے پر تیج ہوتا ہے ۔مہیسہ سُر کومارنے کاتیج !میں وہ تیج دیکھنا چاہتی ہوں۔ اور اس سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ اس ناپاک گھر کی مٹی تیرے لیے اتنی ضروری کیوں ہے کہ تو اسے آبادرکھنے کے لیے ہم جیسی بدنصیبونکو وہاں پہنچادیتی ہے۔ کیا تو بھی خود غرض ہے ؟ بس ایک بار ، صرف ایک بار تم مجھے وہاں لے چلو۔ میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔"

اور دیب نے پیار سے اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرا ،''ٹھیک ہے ، میں تجھے لے جاوں گا۔جا ، تیار ہوجا۔"

پاروتی آنسو پونچھتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ اندر والے کمرے کی طرف لپکی۔ دیب نے بوتلیں واپس الماری میں رکھ دیں۔ بیٹھے بیٹھے کچھ سوچ رہاتھاکہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ دیب نے دروازہ کھولا۔ دیکھا موسی ایک گاہک لائی ہے۔اس نے دھیرے سے دیب کے کان مینکہا ،''تگڑی اسامی ہے۔ پورے پانچ ہزار کا ڈیل ہے۔ صرف دوتین گھنٹے کی بات ہے۔ نوکا میں ۔اگر چیز بھا گئی تو ،سمجھو اسامی پرمانںٹ۔ "

"نہینموسی نہیں ،وہ آج نہیں جائے گی ۔"

"ہائے اللہ ، نہیں جائے گی !کیوں ، کالاسانڈ آئے گاکیا ؟مگر وہ تو سنیچر کو آتا ہے ۔ '' موسی نے پلّو سے پیٹھ اور گردن کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا ۔

"نہیں ،مہیش بابو کی و جہ سے نہیں ۔ پارو کو ضد چڑھی ہے ، پوجا گھومنے کی ۔"

"ہائے اللہ ،پوجاگھومنے کی! اس کا دماغ تو نہیں پھرگیا ؟ سیزن کا ٹائم ہے ۔ گاہگ پورے پاڑہ مینکیڑ ے کی طرح کلبلارہے ہیں ، اور اسے پوجا گھومنے کی پڑی ہے ۔ ٹھہر ، میں ابھی اس کی خبر لیتی ہوں ۔"

دیب نے کہا ،'' خبر کیالو گی ۔ اگر نہیں جائے گی تو چھوڑو ۔ یہاں رنڈیوں کا کون سا اکال ہے ۔''یہ کہہ کر دیب نے اندر سے دروازہ بند کرلیا ۔

مگر موسی کب ماننے والی تھی ؟ساراچکلاسرپراٹھا لیا ،''پارو ، اری او چھنال ماگی ، کہاں گئی رے ، مرگئی کیا ؟ دروازہ کھول!"

موسی کی آواز سن کر پاروتی اندر والے کمرے سے نکل آئی ۔ چوڑے لال پاڑھ والی سفیدریشمی ساری میں ملبوس ۔یوں لگا جیسے پاروتی نے درگا کا روپ دھار لیا ہو ۔ دیب بت بنا کھڑا رہا ۔آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا !

باہر موسی اب بھی گرج رہی تھی ۔ دیب نے دروازہ کھولا ۔ دیب کے چہرے پر ناراضگی کے آثار دیکھ موسی کی آواز مدھم پڑگئی ۔اور پاروتی کی آب وتاب دیکھ کر موسی بھی دنگ رہ گئی ۔ ہکلاتے ہوئے بولی ،''دیب کہہ رہاہے آج تو دھندے پر نہیں بیٹھے گی ۔اتنا اچھامارکٹ چھوڑ کر پوجا گھومنے جائے گی!!"

اس کے بعد دیب سے مخاطب ہو کر عاجزی کرنے لگی ،'' ارے دیبو ، تو ہی اسے سمجھا ۔سال بھر بعد سیزن آتاہے اور یہ حرامی بھری تھالی میں لات مارنے پر تلی ہے ۔اری ہم رنڈی ماگیوں کی کیسی ذات اور کیسی پوجا! جب تک جوانی ہے چار پیسے کما لے ۔ پھر کوئی پھوٹی کوڑی کو نہیں پوچھے گا ۔میناتنی تگڑی پارٹی لائی ہوں اور تو گھر آئی لکشمی کو ٹھکراکرپوجا گھومنے جارہی ہے ۔پاپ لگے گا ، کہہ دیتی ہوں ۔ پاپ لگے لگا ،ہاں ۔"

دیب بولا ، ''موسی ،میں نے کہا نا ۔ جب وہ بیٹھنانہیں چاہتی ہے تو چھوڑ دے اسے ۔ اتنازور کیوں لگارہی ہے ؟"

"اری اس کی متی ماری گئی ہے! اتنا اچھا گاہک کوئی چھوڑتاہے بھلا!!"

جب گاہک نے یہ مہابھارت دیکھی تو وہ دبک کر چل دیا ۔موسی بھی چیختی چلّاتی ہوئی نیچے اتر گئی ۔ بلاٹلتے ہی پاروتی مارے خوشی کے دیب سے لپٹ گئی ۔بولی ،''دیبو ، میں بہت خوش ہوں ۔میں کبھی مہا اشٹمی کے دن ٹھاکر دیکھنے نہیں گئی ۔آج جاوں گی ۔ ماں درگا کی سَندھی پوجادیکھوں گی ۔دیکھوں گی مہیسہ سُر کے بَدھ کے سمئے ماں کاجلال ! اس کا وچے اتسو!!باغ بازار ،اہری ٹولہ ، جوڑا بگان ،ٹالاپارک ، مُحَمَّد علی پارک ، کالج اسکوئر ، سیالدہ سبھی پنڈالو ں میں جاوں گی! الگ الگ روپ میں ماں شکتی کی درشن کروں گی!!"

دیب نے اس کا رخسار چھو کر کہا ،''میں ابھی آیا ۔"

وہ اندر والے کمرے میں چلا گیا ۔ اس نے کپڑے بھی نہیں بدلے تھے کہ ایک بار پھر دروازے پر دستک سنائی دی ۔ ایک للچائی ہوئی آواز آ ئی ،''ارے او پارو ، پارو میری جان ، دیکھ میں آگیا!"

دیب چونک پڑا ۔پاروتی تھراگئی اس نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا ۔خوف و دہشت سے اس کی نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ۔وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی ،''مہیش بابو ، آپ!"

سفیددھوتی کرتاپہنے ساٹھ سال کا کالا جنگلی بھینسے جیساشخص دائینہاتھ میں پیتل کاچھوٹاپان بٹّا اوربائیں سے دھوتی کا کونچا تھامے اچانک یم راج کی مانند اندر گھس آیا ۔دھوتی کے کونچے کودائیں ہاتھ کی کلائی پر رکھااوربائیں ہاتھ سے پان بٹے سے پان کی ایک گلوری نکال کراپنے مٹیالے ہونٹوں کے درمیان ڈال لی ۔ دوسری گلوری نکال کر پاروتی کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا ،''ارے میری جان ، تو تو پاروتی بن گئی ہے ، لے پان کھا ،لے نا ،منہ میں دباتے ہی مستی چھا جائے گی ،تیری قسم!!"

مہیش بابو کو دیکھ کر پاروتی کاخون کھول اٹھتاتھا ۔انھی کی وجہ سے وہ کوٹھے پر بٹھائی گئی تھی ۔ اورآج ان کی بے وقت آمد سے پاروتی کاپارہ مزید چڑھ گیا ۔ اس نے ناگواری سے پوچھا ،'' آپ آج کیالینے آئے ہیں ؟"

"لگتاہے میراآنا تجھے اچھا نہیں لگا ۔ لیکن میں کیا کروں پارو ؟ تجھ سے ضروری کام جو آن پڑا ہے ۔ پوجا کی چھٹی ہے ۔ چار دنوں سے دکان پر تالاچڑھا ہے ۔ تنہائی میں تیری یاد ستانے لگی ، اس لیے چلاآیا ۔"

"آپ جایئے ۔آج مہااشٹمی ہے ۔میں سَندھی پوجا دیکھنے جارہی ہوں ؟"

"ارے تو تو خود درگا ہے ۔" مہیش بابو نے اسے نیچے سے اوپر تک نہارتے ہوئے کہا ،"لے میں مہیسہ سُر بن جاتاہوں ۔کردے میرا بَدھ ۔ سجالے یہیں منڈپ ۔ کرلے یہیں سَندھی پوجا ۔"

یہ کہہ کر مہیش بابو گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور اپنی چھاتی کھول کرپارو کی جانب بڑھادی۔ بولے ، '' دےوی پاروتی ،لے بھونک دے اپنے نینوں کی کٹاری میرے سینے میں!!"

"نہیں ،جائیے آپ ،چلے جایئے !''پارونے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"نہیں دیوی پاروتی ،مینںہیں ٹلنے والا۔بس ،تو میرا بَدھ کر ڈال!!"

پاروتی آپے سے باہر ہوگئی۔پلنگ کے نیچے سے داونکالی اور کھینچ کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن مہیش بابو کی پیشانی پر بل تک نہیں پڑا۔ انھوں نے پاروتی کے آگے اپنا سر جھکادیا اور بڑے اطمینان سے کہا ،''لے میری درگا ، اس مہیسہ سُر کا سر حاضر ہے ۔ کاٹ ڈال ،بَدھ کر دے اس کا۔ ایک جھٹکے میں جسم سے جدا کردے۔یہیں درگا منڈپ ، یہیں سَندھی پوجا ، یہیں مہااشٹمی!! لیکن میں تجھے جو خبر سنانے آیا تھا ،پہلے وہ سن تولے۔ اس کے بعد بڑے شوق سے یہ داومیری گردن پر ماردینا۔"

پاروتی داوکھینچے کھڑی تھی۔غصے سے اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ اس کی نگاہوں کے آگے کل رات والا خواب پھرنے لگا تھا۔

''بتاوں ،دیوی پاروتی ؟''مہیش بابو نے کچھ دیر ٹھہر کر آنکھیں مٹکا ئیں اور خودہی گویا ہوئے ،''توسن کل رات تیرے باپو کوپھر دل کا دورہ پڑا تھا۔ بڑے زوروں کا! ارے خیر منا کہ مجھے خبرمل گئی۔ میں پہنچ گیا۔ تو میرے لیے اتنا کچھ کرتی ہے آخر میری بھی کچھ ذمہ داری بنتی ہے ! میں نے اسے سرکاری اسپتال سے نکال کر بڑے اسپتال مینڈال دیا ہے!! بڑاا سپتال کا مطلب سمجھتی ہے نا ؟ بڑا مہنگا اسپتال!تو گھبرامت ۔ میں نے دیکھ بھال کے لیے ایک نوکر لگارکھا ہے!!"

پاروتی ہنوز داوکھینچے کھڑی تھی ۔مگراس کی آنکھوں میں غصہ نہ تھا ، آنسو تھے ۔ نگاہوں کے آگے کل رات کا خواب نہیں ، بیمارباپ کاچہرہ تھا ۔وہ حواس باختہ کھڑی رہی!

اورپھر ایک دم سے پورا منظر بدل گیا ۔ماں درگامہیسہ سُرکے آگے خود سپردگی کر رہی تھی ۔ اس کے قدموں میں ہتھیار ڈال کرگڑگڑ ارہی تھی ۔ ہاتھ جوڑ کر عاجزی کر رہی تھی ، "نہیں میں درگا درشن کو نہیں جاوں گی ۔سَندھی پوجا نہیں دیکھوں گی ۔آپ جیسا کہینگے ویساہی کروں گی ۔ میرے لِیے تو آپ ہی بھگوان ہیں! آپ ہی سروشکتی مان !! آپ کی پوجا میرا دھرم ہے ۔آپ جو کہیں گے ،جیساکہیں گے ، وہی کروں گی ۔"

دیب پھر بت بن گیا ۔ دروازے کی اوٹ سے ٹکٹکی باندھے فقط دیکھتا رہا ۔

اس عظیم شہر کی فضاڈھاک ڈھول کی آواز اور ماں درگاکی جے جے کار سے گونجنے لگی !!

سَندھی پوجاشروع ہوچکی تھی !!!

* * *

(ایوانِ اردو ، دہلی ، مارچ 2008)

پنر جنم

دفترمینداخل ہوتے ہی میں لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا۔ اروپ چٹرجی سامنے کرسی پر آنکھیں موندے بیٹھے تھے۔جب میں ان کے قریب سے گزرا تو انھوں نے آنکھیں کھول دیں ۔ ہڑ بڑاکر کھڑے ہوتے ہوئے زور سے کہا ،''نمسکار ،سر!!''

مجھے ان کی یہ حرکت خلاف معمول لگی۔ تجسس بھرے لہجے میں پوچھا ،''ارے اروپ بابو ،آج آپ یہاں ؟''

''یہ تو تنخواہ کے دن آیا کرتے ہیں ،مہینے کی آخری تاریخ کو۔ آج توسات اکتوبر ہے ۔ آج یہ کیسے واردہوگئے ؟''میں دل ہی دل سوچنے لگا۔

''ہاں سر ، بس یوں ہی ''وہ کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن پتہ نہیں کیوں الفاظ ان کے لبوں پر آکر منجمد ہوگئے

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ ابھی ٹھیک سے سستایا بھی نہ تھاکہ اروپ بابو کی آواز آئی ، ''مے آئی کم ان ، سر!!''

دیکھا اروپ بابو دروازے پر کھڑے میری اجازت کے منتظر ہیں۔میرے گردن ہلاتے ہی وہ جلدی سے اندر آئے اور 'بیٹھوں' کہہ کر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"سر ،آپ کیسے ہیں ؟"انھوں نے مجھ پرایک شفقت بھری نگاہ ڈالی ۔

"ٹھیک ہوں ۔ آپ کیسے ہیں ؟"

"ٹھیک ہی ہوں ،سر۔ آج ندیا جانے کو دل نہیں چاہا۔ اس لیے یہاں چلا آیا۔ کل سے درگا پوجا کی چھٹی شروع ہو رہی ہے ۔ سوچا اسی بہانے آپ سے مل لوں گا ۔ اس لیے چلا آیا۔ کل سے آپ لوگوں کا بھی رمضان شروع ہوگیاہے۔سر ،جیسی آپ کی عید ویسی ہماری درگا پوجا۔ تمام دھرم تو ایک جیسے ہیں۔ انسانیت کاپاٹھ پڑھاتے ہےں۔ بھائی چارگی سکھاتے ہیں۔"

میں نے کہا ،"آپ پرتیما درشن کرنے کہاں کہاں جاتے ہیں ؟"

وہ شاید میرا اشارہ تاڑ گئے ۔کہنے لگے ،"سر ،ایشور تو ایک ہی ہے ۔ وہ نِرآکار۔ ہم اسے ٹھاکریابھگوان کہتے ہیں ،آپ اسے اللہ یا خدا ۔ لوگوں نے اپنی اپنی سبیدھا انوسار اُس نِرآکار کو آکار دے دیا ہے۔"

میں نے بات بدلتے ہوئے کہا ،"تو اروپ بابو درگا پوجا کی تمام تیاریاں ہوچکیں ؟"

"نہیں ،سر ۔ میں درگا پوجا نہیں مناتا! اس لیے نہیں کہ میں دھرم نہیں مانتا۔ میں روزانہ صبح سویرے گیتا پاٹھ کرتاہوں۔جوگ آسن میں بیٹھ کر اس نِرآکار کا دھیان گیان کرتا ہوں"

ابھی وہ اپنی باتیں پوری بھی نہ کر پائے تھے کہ بڑے بابو ایک فائل لے کر کمرے میں داخل ہوئے۔ فائل میزپر رکھتے ہوئے کہا ،’’کچھ سگنیچرز چھوٹ گئے ہیں ۔‘‘

بڑے بابو نے اروپ بابو کا چہرہ دیکھااور بھوئیں جوڑ کر دیوار گھڑی کی طرف دیکھنے لگے۔اروپ بابو اٹھ کرباہر چلے گئے ۔

-دو-

سات مہینے پہلے اروپ بابو ندیا ضلع سے ٹرانسفر ہوکر ہمارے دفتر میں بحیثیت اپر ڈیوژن کلرک آئے تھے ۔دو چار دنوں ہی میں دفتر کے ہر کام سے اچھی طرح واقف ہوگئے تھے بڑی تن دہی سے اپنا کام کیاکرتے تھے ۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ بڑے گم صم رہتے ہیں۔ لیکن میں نے انھیں کبھی گم صم نہیں دیکھا۔ وہ وقت بے وقت اکثر میری کیبن میں چلے آتے تھے۔سچ پوچھئے توکبھی کبھی مجھے اکتاہٹ ہونے لگتی تھی۔ لیکن میں نے ان سے کبھی کچھ نہیں کہا۔وہ جب بھی میری کیبن میں داخل ہوتے تو ان کے چہرے سے شگفتگی جھلکتی تھی۔ ایک دن ہاتھ میں دو کچے ناریل لے کر آئے اور کہنے لگے ،’’سر ، آج صبح میں نے گاچھ سے ڈاب کٹوائے تھے۔دوپیس آپ کے لیے لایاہوں۔ میرے گاچھ کے ڈاب کا پانی بڑا میٹھاہوتا ہے۔اوریہ صحت کے لیے مفیدبھی ہے ، سر۔ میں ابھی اس کا پانی نکال کر لاتا ہوں۔‘‘

میرے لاکھ انکار کرنے کے باوجوداروپ بابوگلاس بھرناریل کا پانی لے آئے ۔ جب تک میں نے وہ پانی پی نہیں لیا وہ میری کیبن سے باہر نہیں گئے۔

لیکن ایک مہینہ بھی نہیں گزراتھا کہ انھیں ڈیپوٹیشن پر دوبارہ ندیاضلع بھیج دیا گیا۔ شمالی چوبیس پرگنہ کے بعد ہی ندیا ضلع شروع ہوجاتا ہے۔ٹرین سے محض چالیس منٹ لگتے ہیں۔

اب وہ ہمارے یہاں صرف ہر ماہ کے اخیر میں تنخواہ لینے آتے ہیں ۔لیکن جب بھی آتے ہیں ، میرے لیے کچھ نہ کچھ لاتے ضرور ہیں ۔ کبھی کبھی مجھے ان کی یہ حرکت بے تکی بھی لگتی ہے ۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے ۔ سندیش سے بھرا ڈبہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہہ رہے تھے ،"کھجور کے گڑ کا سندیش ۔سر ،کھا کر دیکھئے نا ۔ کتنا سوندھا ہے ۔ سروپ کو بہت پسندتھا ۔"

-تین -

بڑے بابو کے جاتے ہی اروپ بابو پھر چلے آئے ۔اس بار میں نے ہی انہیں کریدا ،''ہاں توبتایئے ، اروپ بابو ، اس بار پوجا کے لیے آپ نے کیا کیا خریداہے ۔اور مہا اشٹمی کی رات کہاں کہاں پرتیما درشن کو جائیں گے ؟"

وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہے ۔پھر ایک سرد آہ بھر کربولے ، ''سر ،سروپ اسی پوجا کے وقت مراتھا ۔ ماں (درگا) سے میری کوئی شکایت نہیں ۔بس یوں ہی اس کے درشن کوجی نہیں چاہتا ۔"

میں نے کہا ،"اروپ بابو ، آخر کب تک آپ اس طرح سوگ منائیں گے ؟"

"سر ،اب زیادہ دن نہیں !!"

"زیادہ دن نہیں !!'' میں نے چونک کر پوچھا ۔

"ہانسر ، زیادہ دن نہیں ۔وہ جلد ہی جنم لے گا ۔ ابھی'ادھولوک 'میں ہے ۔ وہاں کی آتماوں کو پنر جنم لینے میں سمے لگتاہے ۔دو سال ہوگئے ہےں ۔ اب وہ کسی گھڑی بھی جنم لے سکتا ہے ۔"

ان کی بات کاٹ کر ڈرتے ڈرتے آخرمیں نے پوچھ ہی لیا ، ''سروپ کو کیا ہوا تھا ؟"

انھوں نے دونوں کہنیاں میز پر رکھیں اور سر بکف ہوگئے ۔ اداس لہجے میں بولے ، ''سر ، اس سمے وہ بی ایس سی سیکنڈ ایئر میں تھا ۔ایک روز جب وہ فٹ بال کھیل کر لوٹا تو میں نے اس کے دائیں جانگھ پر ایک لال نشان دیکھا ،جو گھاوکی شکل اختیار کر رہا تھا ۔ میرے پوچھنے پر پہلے تواس نے ٹالنے کی کوشش کی ، لیکن جب میں نے کئی بار پوچھا تو اس نے بتایا کہ کچھ دن پہلے بال سے چوٹ لگ گئی تھی ۔ میں فوراً اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا ۔ ڈاکٹر اسے ایک ہفتے تک انجکشن لگاتے رہے ۔لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا ۔ تب انھوں نے کہا کہ اس کا آپریشن کرنا پڑے گا ۔ تورنت!!سر کیا بتاوں ،آپریشن کے چھ مہینے بعدگھاوایک دم اچھاہو گیاتھا ۔ مگر وہ تو فٹ بال کا دیوانہ تھا ۔ ڈاکٹر کے منع کرنے پر بھی فٹ بال کھیلنے سے باز نہ آیا ۔ چھپ چھپا کر کھیلتا رہا“ ۔

اروپ بابو چند لمحوں کے لیے خاموش رہے ۔بائیں ہاتھ سے چشمہ کھولااور دائیں ہاتھ سے رومال نکا ل کرشیشہ صاف کرنے لگے ۔

میں نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے پوچھا ، “پھر کیا ہوا ،اروپ بابو ؟“

اروپ بابو چشمہ پہنتے ہوئے بولے ،''سر ، پانتا بھات (باسی بھات) اور ہلسا مچھلی کا شوقین تھا ۔ مچھلی ماتھے سے بنے گھنٹو (مختلف قسم کی سبزیوں کی ایک مخلوط ترکاری جوبنگالی بڑے شوق سے کھاتے ہیں ۔) پر تو وہ جان دیتاتھا ۔سسٹی کا دن (پوجا کا چھٹا دن) تھا ۔ اس نے تلی ہوئی ہلسامچھلی کے چارپانچ ٹکڑے کھالیے تھے ۔گھنٹو کے ساتھ تھالی بھر پانتا بھات بھی کھالیاتھا ۔اس کے بعد وہ ٹیوشن پڑھنے چلا گیا ۔ ٹیوشن سے جب لوٹاتو میں اس سمئے گھر پر تھا ۔ آتے ہی وہ نل کے پاس دوڑا اور قے کرنے لگا ۔ قے کی آوازسن کر اس کی ماں دوڑتی ہوئی گئی ۔چلا کر کہنے لگی ،“اگو ، سنتے ہو ، دیکھو نا ، بابا بومی کررہا ہے ۔ دیپالی کی دکھ بھری آوازسن کر میرا دل دھک سے ہوگیا ۔ میں دوڑا ۔ آنکھوں میں آنسو لیے دیپالی اس کی پیٹھ

سہلا رہی تھی ۔   میں نے دیکھا اس کے گھاووالے حصے سے خون رس رہا ہے ۔ہاتھ پیر کے ناخن نیلے پڑتے جارہے ہیں۔"

اتنا کہہ کراروپ بابو نے ایک گہری سانس لی ۔میں نے ان کی آنکھوں میں ترچھی نگاہوں سے جھانکنا چاہا ۔انھوں نے نظریں جھکالیں ۔لمحہ بھر کے لیے خاموشی چھائی رہی۔ خود کو سنبھالتے ہوئے اروپ بابو پھر گویا ہوئے:

"اور کیا بتاوں سر ،میں سمجھ گیا۔اس کے بدن میں زہر پھیل رہا ہے ۔میرے پاس والے مکان میں سوبھن بابو رہتے ہیں۔ ان کا بڑا بیٹا بیل ویو نرسنگ ہوم میں لیب اسٹینٹ ہے ۔ میں سروپ کو جلدی سے بیل ویولے جاناچاہتاتھا۔لیکن شہر مینزیادہ ترسڑکوں پرپوجا پنڈال بنائے جانے کی وجہ سے گاڑیوں کی آمدورفت میں رکاوٹ ہو رہی تھی۔ زیادہ تر راستے بری طرح بلاک کر دیئے گئے تھے۔ میں کسی طرح سروپ کو بیل و یو لے گیا۔کس طرح ،سر یہ میں نہیں بتا سکتا ۔وہاں اسے اسٹریچر پر لٹایا ۔ دیپالی کو اس کے پاس چھوڑ کرمیں سوبھن بابو کے بیٹے کوبلانے دوڑا۔ اس نیک لڑکے نے ، سر ، میری بہت مدد کی۔ ڈاکٹروں نے بھی کم کوشش نہیں کی ۔لیکن بالآخر سوبھن بابو کے بیٹے نے مجھے ایک کونے میں لے جاکر کہا ، "کاکا ، یہاں سروپ کے علاج میں بہت پیسے لگیں گے۔"

میں نے کہا ،'' میں دوں گا۔ پچیس ہزار ،پچاس ہزار ،ایک لاکھ ،دو لاکھ!!"

اس نے کہا ،''کاکا ،اس سے بھی زیادہ!''

۔چار۔

اروپ بابو نے ایک لمبی گہری سانس لی اور برص زدہ دودھ جیسی سفید ہتھیلیاں میز پرسیدھے پھیلاتے ہوئے کہا ،" سر ،اس سے زیادہ بولی لگانے کی میری طاقت نہیں تھی۔ دیپالی کو دلاسہ دیتے سمے میری پلکیں بھیگ گئیں۔ سسکیاں

نگلتی ہوئی اس نے اپنے کان کے دونونرِنگ کھول کر بڑھادیئے ،''یہ لو ،گھر میں ایک جوڑی چوڑی ہے ،ایک ہار بھی ہے ،ساری چیزیں بیچ دو - بیس ہزار روپے جمع کئے ہیں-وہ بھی لے لو -مجھے صرف میرا سروپ دے دو-"

'' اس پاگل کو کیا معلوم کہ میں نے جو دو لاکھ کی بولی لگائی تھی ، اس میں اپنے سیونگ اکاونٹ ،اور پی ،ایف ،کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کوبھی شامل کر لیا تھا-ادھر سروپ نڈھال ،بے سدھ پڑاتھا- آنکھیں موندے باربار ،'بابا ،اوبابا' بکتاجارہاتھا-سر ،وہ مجھ سے بڑا مانوس تھا- جب وہ چپ چاپ رہنے لگا تو میں نے ایک دن اس سے پوچھا''سروپ ، توآج کل اتنا بجھا بجھا سا کیوں رہتاہے ؟''میں نے اس سے یہاں تک کہہ دیا تھاکہ اگرپیار ویار کاکوئی چکر ہے ،تجھے کوئی لڑکی پسند ہے ، تو بتا-

سر ،مجھے کیا خبر تھی کہ اس کی چپی کی وجہ اس کاروگ ہے - ہم پریشان نہ ہوں اس لیے اس نے ہم سے اپناگھاوچھپائے رکھا-سر ، اسے ہماری بہت چینتا تھی - شایدوہ مجھے اپنی ماں سے بھی زیادہ چاہتا تھا- مرتے وقت بھی وہ 'بابا ،بابا'کہہ رہاتھا-اسی لیے تو سر ، اسے پنر جنم لینے میں اتنی دیر لگ رہی ہے-"

میں نے اروپ بابو کامن ہلکا کرنے کی غرض سے موضوع بدلنا چاہا ، '' لیکن اروپ بابو ، پنر جنم والی بات میرے پلے نہیں پڑی!"

"سر ، شاستر میں لکھا ہے کہ مرتے سمے اگر کسی کی زبان پر 'اوم' شبدرہے تو اس کی آتما ادھولوک میں چلی جاتی ہے-وہاں وہ مہان آتماوں سے ملتی رہتی ہے-اس لیے اسے واپس مرتولوک آ نے میں دیر لگتی ہے- مرتے سمے سروپ کی زمان پر 'بابا ،بابا'تھا- بچوں کے لیے ماں باپ بھی تو بھگوان کی طرح ہیں-اس لیے مجھے پورابھروسہ ہے کہ سروپ اس سمئے ادھولوک میں ہے-لیکن اب وہ جلد ہی آ جائے گا-"

”مگر اسے آنے میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے ؟‘‘ ان کی فلسفیانہ باتوں پرمیری دلچسپی بڑھنے لگی ۔

”سر ،پچھلے جنم میں شاید میں نے اس کا دل دکھایاہوگا ۔اسی لیے وہ مجھے اس طرح تڑپارہاہے ۔لیکن وہ آئے گا ۔میرادل کہتاہے ،سر ، وہ بہت جلد آئے گا ۔اور تب میں اس سے معافی مانگ لوں گا ۔ جب تک میں اس سے معافی نہ مانگ لوں ، مجھے اس جنم میں مکتی نہیں ملنے والی ۔اسی لیے تومیں اس کے آنے کی راہ تاک رہا ہوں ۔سر ، وہ“

اسی درمیان ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی ۔میں نے ریسیور اٹھایا اوروہ پلکیں پونچھتے ہوئے اٹھ کرباہر چلے گئے ۔

ریسیور رکھ کر میں فائلوں پرجلدی جلدی نگاہیں پھیرنے لگا ۔ ابھی دو تین فائل بھی نہیں دیکھ پایا تھا کہ اروپ بابو پھرسے واردہوگئے ۔ ہاتھ مینپولتھین کا ایک پیکٹ لیے ۔پیکٹ میرے بیگ کے پاس رکھتے ہوئے بولے ،’’سر ،اس میں ہلسامچھلی کے دوٹکڑے ہیں ۔تھوڑا ساپٹالی گڑ بھی ہے ۔“

’’لیکن میرا تو روزہ ہے ۔“

”توکیا ہوا ، سر ۔شام کو روزہ کھولنے کے بعد کھا لیجئے گا ۔“

میں نے دبے لہجے میں کہا ،’’ہونہہ ،توسروپ کو پٹالی گڑ بھی پسند تھا ؟“

”ہاں سر ،بہت ۔لیکن آپ کو کیسے !!‘‘ وہ غور سے میری طرف دیکھنے لگے ۔

میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا ۔ یایوں کہئے کہ گھبراہٹ میں میری زبان سے نکل گیا ،’’پھر آپ سروپ کوبیلویو سے کہاں لے گئے ؟ “

وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے اورکہنے لگے ،"آر جی کار اسپتال ۔لوگ کہتے ہیں کہ سرکاری اسپتال میں روگیوں کی ٹھیک سے دیکھ بھال نہیں کی جاتی ۔ لیکن سر ، وہاں بھی کسی ڈاکٹر نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی ۔ بائیس بائیس سو کے پانچ انجکشن لگائے ۔ لرزتے ہاتھونسے اپنی گردن کے دونوں جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ،''سر یہاں ،یہاں سے ''

۔پانچ ۔

اسی درمیان مادھوی مکھرجی اور کرشنا گنگولی میری کیبن میں داخل ہوئیں ۔کہنے لگیں ،'' سر ،کل سے پوجا ہے ، کچھ مارکیٹنگ کرنی ہے اگر ...."

میں سمجھ گیا کہ آج وہ جلدی جاناچاہتی ہیں۔تہوار کا معاملہ تھا ۔لہٰذا میں نے مسکراتے ہوئے سر ہلادیا ۔ان کے جاتے ہی اروپ بابو پھر گویا ہوئے :

"کیا بتاوں سر ، آئی سی یوکے باہر دیپالی اور میں رات بھر پرارتھنا کرتے رہے ۔ صبح کو نرس کی خوشامد کی تو اس نے کچھ دیر کے لیے مجھے اندر جانے کی اجازت دے دی ۔ مجھے دیکھ کر سروپ مسکرایا ۔"بابا آپ ساری رات یہیں تھے ؟ ماں بھی یہیں ہے ؟"

"کیسا لگ رہا ہے ، بیٹا ؟''میں نے اس کاسر سہلاتے ہوئے پوچھا ۔

"ٹھیک ہوں ،بابا ۔لیکن !!'' اس نے دھیرے سے کہا ۔

"لیکن کیا !!'' میں نے گھبراکرپوچھا ۔

اس نے تل پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ، ''یہاں ،سخت ہوگیا ہے ۔ رات سے پیشاب نہیں اتراہے ۔"

”فکر نہ کر۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔‘‘ میں نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا اور بھاگتا ہوا ڈاکٹر کے پاس پہنچا ۔ میری بات سنتے ہی ڈاکٹر سروپ کی بیڈکو لپکے ۔پیچھے پیچھے نرس اور وارڈ بوئے بھی دوڑے ۔سروپ کو ڈائی لیسس روم میں لے جایا گیا۔ہم بے چینی سے باہر انتظار کرتے رہے ۔ تھوڑی دیر بعد جب اسے باہر نکالا گیا تو سروپ کے چہرے پر عجیب سی ایک طنزیہ ہنسی تھی۔جیسے وہ کہہ رہا ہو ۔’ساری کوششیں بے کار ہیں ۔ میں اورنہیں رکنے والا۔‘

”اور پھرڈاکٹر نے بارہ گھنٹے کا ٹائم دیا“

باہر پوجا پنڈالوں سے اب بھی مائیک کی آوازیں آرہی تھیں ۔ رہ رہ کر سنکھ اور ’اُلو‘(بنگالی عورتیں شادی بیاہ ، پوجاوغیرہ کے موقعوں پرہونٹوں اور زبان کی مدد سے ایک طرح کی آواز نکالتی ہیں۔) دَھونی بھی سنائی دے رہی تھی ۔ اگربتی اور لوبان کی سوگندھ دکھنی کھڑکیوں سے داخل ہوکراسپتال کی بدبودار فضا کومہکا رہی تھی۔

رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے ۔بارہ گھنٹے پورے ہونے میں اب صرف چند منٹ ہی بچے تھے۔ دیپالی گھڑی پر نظریں جمائے جمائے پتھراگئی تھی۔جیسے جیسے منٹ کی سوئی بارہ پر پہنچ رہی تھی میری نظروں کے سامنے ٹنگی گھڑی دھندلانے لگی تھی۔نو کا گھنٹہ سنتے ہی میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے ۔ دیپالی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے پاس بیٹھا ہی تھا کہ ایک نرس نے آکر کہا ،’روپ بابو ، اندر آیئے۔‘

”ہم جلدی سے سروپ کی بیڈ کی طرف لپکے۔ سر ،ہمیں دیکھتے ہی اس نے اپنی بانہیں میری طرف پھیلادیں ۔ دیپالی اس کے پیروں سے لپٹ گئی۔میرا داہنا ہاتھ پوری طرح سروپ کی انگلیوں کی پکڑمیں تھا۔سروپ نے کہا ،’’بابا ،اپنا خیال رکھنا !!‘‘اچانک میرے ہاتھ پر اس کی پکڑ اور بھی سخت ہوگئی۔ پھر ہلکی سی ایک

ہچکی اور اس کے ساتھ میرا ہاتھ اس کی انگلیوں کی پکڑ سے آزاد ہو گیا۔ سروپ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں ، سر۔لیکن ہونٹ مسکر ارہے تھے“ ۔

۔چھ ۔

اس وقت اروپ بابو کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کے ہلکے ہلکے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔شایدوہ سروپ کی اس مسکراہٹ کی نقل اتارنا چاہتے تھے ۔میں نے کہا ، “آپ جو درگا پوجا نہیں مناتے اس سے سروپ کی آتما کو تکلیف نہیں ہوگی ؟ ” میرا مقصد ان کا غم غلط کرنا تھا۔

”سر ،آپ شاید ٹھیک کہہ رہے ہیں۔لیکن جب تک اس کا پنر جنم نہیں ہوجائے اور میں اس سے معافی نہ مانگ لوں ،میں کوئی تہوار کیسے مناسکتا ہوں ؟ “

اروپ بابو بڑے جذباتی ہوگئے تھے۔میں نے ان کا ذہن ہٹانے کے لیے بات گھمانے کی کوشش کی۔ کہا ،''اروپ بابو پانتا بھات آپ کو کیسا لگتاہے۔ میں نے پچھلے ہفتے کھایاتھا۔مجھے تو بڑا اچھا لگا۔ بار بار کھانے کو جی کرتاہے۔ اس سے پیٹ بھی ٹھنڈا رہتا ہے۔ ہے نا ؟ “

وہ دم سادھے مجھے دیکھنے لگے ۔اور تب میری زبان سے غیر ارادی طورپر نکل گیا ، ''اچھا ، بتایئے گڑ کا سندیش کب کھلا رہے ہیں۔ پچھلی بار آپ نے کھجور کے گڑ کاجو سندیش کھلایا تھا اس کی سوندھی سوندھی خوشبو آج بھی میری سانسوں میں بسی ہے۔''

اروپ بابو نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ ٹکٹکی باندھے تھوڑی دیر مجھے دیکھتے رہے ۔

باہر بجلی کڑک رہی تھی ۔آسمان پر سیاہ بادل چھانے لگا تھا ۔ میں نے پھر بات بدلنی چاہی ۔کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا ،''بادل گھِرآیاہے ۔لگتاہے موسلادھار بارش ہوگی ۔"

اور تب اروپ بابو کرسی سے اٹھے اورہاتھ جوڑکر کچھ کہا ۔مگر ان کی آواز میری سماعت تک نہیں پہنچ سکی ۔بجلی کی ایک زوردار کڑک میں گم ہو گئی ۔

۔سات ۔

ہمارے آفس میں ایک ریکریشن کلب ہے ۔درگا پوجا کی چھٹیوں کے بعد جب دفتر کھلتاہے تو کلب کی جانب سے وجو یا سمیلنی منائی جاتی ہے ۔لوگ گلے ملتے ہیں ۔ ہاتھ جوڑ کر ایک دوسرے کوپرنام کرتے ہیں ،'شبھ وجویا' کہہ کر بدھائی دیتے ہیں ۔ (چونکہ یہ فتح ماں درگا کی ہے اس لیے وجویا یعنی وجے کی تانیث لفظ استعمال کیا جاتاہے ۔)

اس دن بھی لوگ ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے کہ یکایک میری نظر اروپ بابو پر جا ٹکی ۔ میں دنگ رہ گیا ۔ اروپ بابو ہلکے سنہرے رنگ کے ریشمی کرتے اور ادّھی کی سفید دھوتی میں کھِل رہے تھے ۔ ڈوری سے بندھا مٹی کا ایک بڑا بھانڈاان کے دائیں ہاتھ میں جھول رہا تھا ۔ وہ میرے پاس آئے اور بھانڈا میر ی طرف بڑھاتے ہوئے چہک کر بولے ،''سر ، سروپ کا پنر جنم ہوگیاہے !!"

میں تجسس سے ان کامنہ تکنے لگا ۔انھوں نے لپٹ کر مجھے زور سے بھینچا ، 'شبھ وجویا' کہہ کر بدھائی دی اور مسکراتے ہوئے پھرسے کہا ، ''سروپ کا جنم ہوگیاہے ، سر!!''

ہربار کی طرح اس باربھی وجویاسمّیلنی میں زیادہ تر اسٹاف اپنے گھروالوں کو ساتھ لائے تھے ۔بڑے دھوم دھام سے وجو یا سمیلنی منائی گئی ۔ کرشنا گنگولی نے

نذرل گیت گائے ۔ بڑے بابو کی بیٹی نے ہاتھ میں ایک تارا لے کر جھوم جھوم کر باول گیت سنائے ۔ دلہن کے لباس میں سجی سنوری مادھوی مکھرجی کی دونوں بیٹیوں نے شاندار نِرتّے پیش کیاکچھ دوری پر ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی ۔بہت دیر سے مجھے گھور رہی تھی ۔میری نگاہ بھی اس پر ٹکی جارہی تھی ۔ ہلکے فیروز ے رنگ کی جامدانی ساری میں ملبوس ، گوری چٹی وہ خاتون کون ہے ؟ باربار میرے دل میں یہ سوال پیداہورہا تھا ۔

پیڈسٹرل فین کی تیز تند ہواوں میں اس کی لمبی گھنیری زلفیں ساون کی گھٹاوں کو شرما دینے پر آمادہ تھیں ۔ کلائیوں پر دودھیا رنگ کے سنکھ کی موٹی موٹی چوڑیاںاورگلے میں سونے کا ہاراورہار سے لٹکتاہوا سواستک کا لاکٹ ، اس کے حسن میں چار چاند لگا رہے تھے ۔ میری نظریں اس پر ٹکی ہوئی تھیں اور اس کی مجھ پر!! اب اس کے لبوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹیں نمایاں ہونے لگی تھیں ۔تبھی نقیب کی آواز فضامیں گونجی ، ”اب میں دیپالی دی سے انورودھ کروں گا کہ وہ اسٹیج پر آئیں اوراپنی سندر آوازمیں ہمیں ایک ربندر سنگیت سنائیں ۔ “

میری نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ۔میں نے مڑ کر دیکھا اروپ بابو ایک کونے میں بیٹھے کھلکھلا رہے تھے ۔

اور جب ’دیپالی دی‘ ربندر سنگیت گانے لگیں تواروپ بابو ہتھیلیاں اچھال اچھال کرتال دینے لگے ۔دھیمے دھیمے سُر میں ربندر سنگیت کی مدھر لَے میرے کانوں میں رس گھولنے لگی:

بچہ پوچھتا ہے ماں میری یہ بتا ،

تونے جنم دیاہے یالائی ہے مجھ کو کہیں سے اٹھا ؟

چھاتی سے لگا کر ماں ہنستی ہے

پھر آنسوبہاکربچے سے کہتی ہے:

آرزو بن کر میرے دل میں چھپا ہوا تھاتو

کھو نہ جائے توکہیں پھر سے ،

آجا چھاتی میں چھپا لوں تجھ کو (نظم: جنم کتھاربندر ناتھ ٹیگور ترجمہ)

-سات-

تنخواہ والے دن جب شام ہونے کو آئی اور اروپ بابو میرے کمرے میں نہیں آئے تو میں نے بڑے بابوکو بلاکر پوچھا ،''کیوں ؟آج اروپ بابو تنخواہ لینے نہیں آئے ؟ ''

''آئے تھے ، چلے گئے -ریلیز آرڈربھی لے گئے ہیں- ''

''ریلیز آرڈر!!'' میں نے حیرت سے پوچھا-

''ہاں ، ان کا ٹرانسفر ہوگیا ہے- ''

بڑے بابو کے لہجے میں نرمی کچھ زیادہ تھی-

''ٹرانسفر!! '' میں چونک پڑا-

''ہاں ، ان کا کوچ بہارٹرانسفر ہوگیاہے- ''

''کوچ بہار ،لیکن کوچ بہار تو یہاں سے بہت دور ،اتر بنگال میں ہے !!''

''ہمیں بھی تعجب ہے ،سر-'' بڑے بابو نظریں جھکاکر بولے-اور پھر ایک لفافہ بڑھاتے ہوئے کہا ،''یہ آپ کو دینے کے لیے کہہ گئے ہیں- ''

میں دیر تک بڑے بابو کا منہ تکتا رہااور جب وہ میرے کمرے سے باہر چلے گئے تو میں نے جھٹ سے وہ لفافہ کھولا-

اس میں کچھ تصویریں تھیں!

میں گھبرا کر کھڑا ہوگیا! غور سے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا!!!اوردم بخود تھپ سے کرسی پر بیٹھ گیا!!!

* * *

(آجکل ، نئی دہلی ، جولائی 2007)

چوتھا فنکار

بوڑھے نے بڑی احتیاط سے ہونٹوں کے ایک کونے میں بیڑی دبائی اور پھرسے وہی قصہ چھیڑا۔ یہ قصہ سناتے وقت بوڑھے پر ایک اضطرابی کیفیت چھاجاتی تھی۔

"چاردوست تھے ۔چاروں نے بھگوان وشو کرما سے پرارتھنا کی ۔اے بھگوان ! ہمیں کوئی انوکھا فن سکھلادے ۔بھگوان وشوکرمانے ان کی پرارتھنا سوئیکار کرلی۔ انھیں بارہ برس تک سکھاتے رہے ۔وہ بھی پورے جی جان سے سیکھتے رہے ۔ پہلے نے ہڈیاں جوڑ جوڑ کر ڈھانچہ بنانا سیکھا ۔دوسرے نے اس پر ماس جمانا سیکھا ، تیسرے نے اس پر چمڑے کا غلاف چڑھاناسیکھا۔"

حسب عادت بوڑھے نے کئی باریہ قصہ دہرایااور خاموش ہوگیا ۔ بوڑھے کو خاموش دیکھ کر اس مرتبہ بھی لڑکے کو تجسس ہوا!اس نے پھروہی سوال پوچھا ، ''اور چوتھے نے ؟"

بوڑھا گم صم کھڑارہا ۔وہ شاید چوتھے فنکار کے بارے میں کچھ بتانانہیں چاہتا تھا یاپھراسے اس کے بارے میں کوئی علم ہی نہ تھا۔

لڑکے کا تجسس ہنوز برقرار تھا ۔اورجب بوڑھے کو اس کے تجسس کا احساس ہواتو اس نے بیڑی کے ٹکڑے کوپھونک مار کر پھینکااور کہا ، ''ابے !گھبراتا کیوں ہے ؟ اس کے بارے میں بھی بتاوں گا! دھیرج دھر"!!

اور لڑکا پھر سے بانس کی ٹھٹری میں پوال باندھنے لگا۔بوڑھے نے ایک اور بیڑی سلگائی ۔جلدی جلدی دو چار کش لگائے ، کمر میں گمچھا باندھا ، انگلیوں کے درمیان اپنے پچکے گال رکھے ،داڑھی کے بال اینٹھے ، تھوڑی دیرکچھ سوچا اور کام میں جٹ گیا۔

اب اس کا ہاتھ تیزی سے چل رہاتھا۔رفتہ رفتہ پوال نظروں سے اوجھل ہورہی تھی۔وہ بائیں ہاتھ سے ڈھانچے کو سہارا دیئے دائیں ہاتھ سے مٹی تھوپ رہاتھا۔ہتھیلی کے نچلے حصے سے تھپکیاں بھی لگارہاتھا۔ جہاں مٹی زیادہ ہوجاتی وہاں انگلیوں سے کاڑھ لیتا ،جہاں مٹی کم پڑ جاتی وہاں چپکادیتا۔رہ رہ کر بیڑی کاسراانگارے کی طرح دھکنے لگتااور دوسرے ہی لمحہ اس پر راکھ کی تہہ جم جاتی ۔

لڑکا پوال باندھ رہاتھا ،لیکن نظریں بوڑھے کی ہتھیلیوں اور انگلیوں کی جنبش پر ٹکی ہوئی تھیں۔

اورجب بوڑھالڑکے کو دیکھتاتو مسکرادیتا۔ ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ،''ابے ، مورتی ہاتھ میں نہیں ہوتی ہے ۔'' اور پھردا یاں ہاتھ سینے پر زور سے تھپک کر کہتا ، ''مورتی یہاں ہوتی ہے۔سمجھا ، یہاں ، اس کے اندر!''

لڑکا حیرت سے بوڑھے کا سینہ تکنے لگتا۔اوبڑ کھابڑ ،ہڈیاں ہی ہڈیاں ،گوشت کا نام ونشاں نہیں!!بوڑھے کاہاتھ تیزی سے چلنے لگا۔

اور جب بانس کی ٹھٹری پر پوال باندھنے کاکام مکمل ہوگیا تو لڑکے نے ڈھانچے کو گھماپھراکر دیکھا۔جسم کے نشیب وفراز کامختلف زاویوں سے معائنہ کیا۔انگلیوں سے کھینچ تان کرڈوری کے دم خم کاجائزہ لیا۔ ''باباکوایسا ہی کسا ہوا ڈھانچہ پسند ہے۔''اس نے من ہی من کہااور پھرسے بوڑھے کو ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا ، ''بابا کے

ہاتھوں مینجادوہے! چھوتے ہی ہاتھ ، پاوں ،پیٹ ،سینہ ،نابھی ، گردن سب ایک ایک کر کے ماٹی سے نکلنے لگتے ہیں !!‘‘

بوڑھے نے چھاتی پر مٹی تھوپ کر چھوٹے چھوٹے دو ٹیلے بنادیئے تھے ۔اب وہ ان ٹیلوں پر ہتھیلیاں پھیررہاتھا۔ اور جب وہ ایسا کرتا تھا تو اس پر عجیب سی ایک کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ چہرہ تمتمانے لگتاتھا۔ آنکھوں کی پتلیاں ناچنے لگتی تھیں ،ہونٹ کپکپانے لگتے تھے۔ سانس ٹوٹنے لگتی تھی ۔پہلے پہل لڑکے نے گھبرا کراسے جھنجوڑاتھا۔جواباً نرم اور نازک رخسار پر طمانچہ کھایا تھا۔اس کے بعد کبھی اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ ایسی حالت میں بوڑھے کے قریب پھٹکے ۔

اورجب سینے کاتناوپوری آب وتاب سے نمایاں ہوجاتا تو بوڑھے کے چہرے پرسرور و انبساط کی ہزاروں لہریں دوڑ جاتیں۔وہ مسکراتے ہوئے لڑکے کی طرف دیکھنے لگتا۔سو اس نے اس بار بھی دیکھا ۔ صرف دیکھا ہی نہیں بلکہ ایک بے تکا سا سوال بھی پوچھ لیا ، ’’اچھا ، بتا تو ،بے ، تونے کبھی کسی ناری کا سریر دیکھاہے ؟ ایک دم ننگ دھڑنگ سریر !!‘‘

لڑکاہکّا بکّا بوڑھے کوتکنے لگا۔وہ تو اس کی بڑی عزت کرتا تھا۔ اسے بھگوان سمجھتاتھا۔بھلا بھگوان بھی اس طرح کے سوال کرتے ہیں !! لڑکا پس و پیش میں پڑ گیا!

’’کیاہے ، جواب کیوں نہیں دیتا ؟‘‘

لڑکے سے کچھ کہا نہ گیا۔

پاٹ اور مٹی کا گلاوا گڑھے میں پڑا پڑا سڑ چکا تھا۔ بدبو آنے لگی تھی۔نالے میں کیچڑکے سڑ جانے سے بھی ایسی ہی بدبوآتی ہے ۔ بدبو لڑکے کے نتھنوں کو چھونے لگی! اوریکسراس کی نظروں کے سامنے کا منظر بدل گیا!!

-دو-

بھادوں کی امس اور ہوابند ! گرمی ایسی کہ دم گھٹ جائے ۔ سڑک اور فٹ پاتھ کے درمیان چوڑاایک نالہ ،کیچڑ سے اٹا ہوا۔ نالے کاپانی سڑ چکاہے۔چھوٹے چھوٹے کیڑے کلبلارہے ہیں۔ ناک نہیں ٹھہرتی ۔ نالے سے لگا ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہے ۔ جھونپڑے میں بچہ ماں کی چھاتی سے چپکا سورہاہے۔اچانک بچے کی آنکھیں کھل گئیں ۔ وہ حیرت میں پڑگیا۔ اسے محسوس ہواکہ اب وہ راستے پر اکیلا پڑاہے ۔ چاند میں بیٹھی بڑھیا چکی پیس رہی ہے۔ ہر طرف چاندنی پھیلی ہے۔

”میں یہاں کیسے ؟ “ بچہ اپنے ننھے سے ذہن کو جھٹکتا ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔اس کی نگاہ جھونپڑے پر پڑتی ہے ۔ ایک شخص جھونپڑے سے باہر آتاہے اور لنگی باندھتا ہو ا پُر پیچ راستوں میں گم ہوجاتا ہے۔ بچہ جھونپڑے کی طرف لپکتا ہے ۔ اور جیسے ہی قدم اندر رکھتا ہے ٹھٹک کر رہ جاتاہے۔ ماں کے جسم پر ایک دھاگابھی نہیں۔وہ آہٹ سنتی ہے۔ بدن پرساری کھینچ لیتی ہے۔ پیٹھ پھیر کرسو جاتی ہے۔بچہ کھڑا کانپنے لگتاہے۔لڑکا بھی کانپنے لگا۔بوڑھے نے سوال دہرایا ، ”کیاہے! جواب کیوں نہیں دیتا ، دیکھا ہے ؟ “

لڑکے نے نفی میں سر ہلایا۔

بوڑھے نے کہا ،”جاپہلے دیکھ کر آ ،پھرمیں تجھے آگے کا سبق سکھاوں گا۔اور ہاں سن جیسے تیسے مت دیکھنا۔ غورسے دیکھنا۔ایک ایک چیز دیکھنا ، اچھی طرح سے دیکھنا ۔ بھوئیں کتنی کھنچی ہوئی ہیں ،پیشانی کتنی چوڑی ہے ،گردن کوتاہ ہے یا صراحی دار ،پیٹ پربل کتنے ہیں ،چھاتیاں تنی ہوئی ہےنیاجھولی ہوئیں ، پھول نیلا ہے یا بھونرا ، ہونٹ گلابی ہیں یا کتھئی ،نابھی گہری ہے یا ابھری ہوئی۔ٹانگیں چکنی ہینیاروئیں دار“

لڑکے کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہاتھا ۔وہ بوڑھے کوحیرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا ۔ بوڑھے نے مزید کہا ،''سن ماٹی کوہاتھ لگانے سے پہلے دونوں آنکھیں بند کرلینا ۔ ذہن کے پردے پراس ننگ دھڑنگ ناری کی چھبی دیکھنا ۔آنکھ ،ناک ،کان ،ہونٹ ،کپال ، کندھا ، چھاتی ، پیٹ ، نابھی ، چوتڑ ، کمر ، ٹانگیں ، بانہیں سب اچھی طرح من میں بسا لینا ۔ اس کے بعد بچالی (پوال)کے اس ڈھانچے میں ماٹی جماتے جانا ۔یاد رہے نظروں سے وہ چھبی اوجھل نہ ہونے پائے ۔ ''

بوڑھا تھوڑی دیر خاموش رہا ۔ پھر مسکرایا اور بولا ،''اچھاایک کام کر ،ماٹی مینچال (چاول)کی تھوڑی سی بھوسی اور ملادے ۔ ''

لڑکے نے پوچھا ،''اور پاٹ ؟''

''نہیں پاٹ ملانے کی ضرورت نہیں ۔ ''

لڑکامٹی کے گڑھے میں بھوسی ڈال کر کچھ دیرپیروں سے رلایا پھر دھیمی آواز میں بولا ،''بابا ،ایک بات پوچھوں ؟''

بوڑھے نے اثبات میں سر ہلادیا ۔

لڑکے نے پوچھا ،''بابا ، آپ کی ماں نہیں ہے ؟''

''ارے جب تیری ماں نہیں ہے تو مجھ جیسے بوڑھے کی ماں کیسے ہوسکتی ہے !ہاں ،ایک بیوی ضرور ہے ۔لیکن میرے ساتھ رہنا اسے گوارا نہیں ۔وہ جو کھال (نہر)کے پاس نیا اسٹیشن بنا ہے ۔کولکاتااسٹیشن !حرام زادی ،وہیں رہتی ہے ۔داروبیچتی ہے ،اور سنا ہے ، دھندہ بھی کرتی ہے ۔ ریلوے کے جتنے سپاہی ہیں اس کے گاہک ہیں ۔ ان کے ساتھ سوتی ہے ۔ سوتی رہے سالی ، میں کسی کی پروا نہیں کرتا ۔ اور تو سن عورتوں کا صرف بدن دیکھنا ، غور سے دیکھنا ،ایک ایک انگ

دیکھنا ،لیکن خبردار ان کے ساتھ سونانہیں !عورت کے ساتھ سونے سے آدمی نشٹ ہو جاتا ہے! کسی کام کا نہیں رہتا!“

بوڑھے کالہجہ بھرّاگیا۔ آنکھیں نم ہونے لگیں۔رات بھربوڑھا اسی طرح بکتا رہا۔ خوب دارو پیتارہا۔ اوراپنی بیوی کو گالیاں دیتا ہوا زمین پر بدحواس سوگیا۔

-تین-

بوڑھا دن چڑھے تک سوتارہتاتھا۔اس نے پارک کی پچھلی باونڈری وال سے پولیتھین باندھ کر چھوٹی سی ایک جھونپڑی بنارکھی تھی۔ جھونپڑی کے سامنے ہی وہ مورتیاں بناتاتھا۔ پارک کے دوسرے سرے پر واٹرسپلائی کے پائپ میں ایک جوڑتھاجس سے خاصا پانی رستاتھا۔ تھوڑی دور فٹ پاتھ کی بائیں طرف کئی جھونپڑیاں تھیں ۔ ان جھونپڑیوں میں رہنے والے صبح ہی سے وہاں بھیڑ لگادیتے تھے۔عورتیں برتن اور کپڑا دھونے بیٹھ جاتیں ، توٹلنے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔ لڑکا علی الصباح جاگ جاتا اوروہاں سے پرانے پلاسٹک کے جارمیں پانی بھر لاتا۔گڑھے میں مٹی اور پانی ڈال کر پیروں سے گوندھتا۔ غرض یہ کہ بوڑھے کے جاگنے تک اوپر کا تمام کام نپٹادتیاتھا۔ گڑھے میں سوکھی مٹی ڈال کرجب وہ پانی ملاتا تو آس پاس کی فضا سوندھی سوندھی خوشبوسے مہک اٹھتی تھی۔لڑکے کو یہ خوشبو اچھی لگتی تھی ۔ بملا کوبھی بھاتی تھی ۔

ہاں ،وہاں چھوٹی سی ایک بچی بھی رہتی تھی۔اس کی پیاری پیاری باتیں لڑکے کو کھینچنے لگیں۔ ایک دن اس نے بچی سے کہا ،’’میرے ساتھ چل ، ماٹی کی گڑیاں دوں گا۔“

اور جب بچی آتی تو وہ اسے چھوٹی چھوٹی گڑیاں بناکر دے دیتا تھا۔ اگرچہ ان گڑیوں میں ہزارونعیب ہوتے تھے ، لیکن بچی انہیں بڑے چاوسے لے لیتی تھی ۔

شروع شروع میں تووہ گڑیوں کے لالچ میں چلی آتی تھی ،لیکن رفتہ رفتہ اس کا ذہن بڑی بڑی مورتیوں کی طرف مائل ہونے لگا۔ وہ گھنٹوں بوڑھے کومورتیاں بناتے دیکھا کرتی تھی ۔ اپنی پیاری پیاری باتوں سے بوڑھے کابھی من موہ لیتی تھی۔

اور جب بوڑھا وہی پرانا قصہ سناتاتووہ بھی غور سے سنتی:

”چاردوست تھے ۔چاروں نے بھگوان وشو کرما سے پرارتھنا کی۔ اے بھگوان ! ہمیں کوئی انوکھا فن سکھلادے ۔بھگوان وشوکرمانے ان کی پرارتھنا سوئیکار کرلی۔ انھیں بارہ برس تک سکھاتے رہے ۔وہ بھی پوری جی جان سے سیکھتے رہے ۔ پہلے نے ہڈیاں جوڑ جوڑ کر ڈھانچہ بنانا سیکھا ۔دوسرے نے اس پرماس جمانا سیکھا ، تیسرے نے اس پر چمڑے کا غلاف چڑھاناسیکھا۔“

اور جب بوڑھا خاموش ہوجاتاتولڑکے کے ساتھ ساتھ وہ بھی تجسس بھرے لہجے میں وہی سوال دہراتی ،''اور چوتھے نے ؟ “

جب بوڑھے سے کوئی جواب نہیں بن پاتاتوبچی بے باکی سے کہتی ،'' چھوڑیئے چھوڑیئے ،آپ کو پتہ نہیں ہے“!

لیکن بوڑھااس کی بات کا برا نہیں مانتاتھا ، بس ہنس دیتا تھا ۔

۔ چار ۔

بچی روزانہ صبح سویرے آنکھیں ملتی ہوئی چلی آتی تھی اور لڑکے کے ساتھ بیٹھ کر کبھی گڈا ،کبھی گڑیا ،کبھی توتا ،کبھی مینا ،کبھی شیر اورہاتھی بنایا کرتی تھی۔ سامنے سیمنٹ کاایک بوسیدہ ڈرین پائپ پڑا تھا ۔وہ اس پر بیٹھ جاتی اور دیر تک اس سے باتیں کیاکرتی تھی۔

ایک دن لڑکے نے کہا ،'' بملا ،دیکھ میں نے رات بھر جاگ کر تیرے لیے ماں کالی کی پرتیما بنائی ہے ۔دیکھ اس کی زبان دیکھ ، کتنی لمبی ہے!! اس کے گلے میں منڈیونکی یہ مالادیکھ !! کتنی محنت سے ایک ایک سر بنایا ہے ۔انھیں دھاگے میں پرویا ہے ۔دیکھ ، اس کے ایک ہاتھ میں کٹی ہوئی ایک بڑی سی منڈی لٹکاوں گا اوردوسرے میں یہ داواور یہ سیاربھی بنایاہے ،جو منڈی سے ٹپکنے والا خون چاٹے گا ۔ اور دیکھ یہ بابا بھولے ناتھ کا پتلا ہے ۔ اسے چت لٹاکر ماں کالی کی پرتیما اس پررکھ دوں گا"

بچی نے ہونٹ بچکاکر کہا ،''نہیں ،ٹھیک نہینہوا ۔ماں کالی کے توچار ہاتھ ہوتے ہیں ، اس کے دوہیں ۔شیو ٹھاکر کی جٹا بھی نہیں ہے ۔شیر کی چھال کہاں ہے ؟"

لڑکا اداس ہوگیا ۔اس نے تمام مورتیاں توڑ ڈالےں ۔

ویسے بھی وہ ہرروز بوڑھے کے جاگنے سے پہلے اپنی بنائی ہوئی تمام مورتیاں توڑ کر گڑھے مینڈال دیتاتھا اور مٹی کو اس طرح ملادیتاتھاکہ بوڑھے کو اس کی بھنک بھی نہیں مل پاتی تھی ۔اسے ڈر تھا ،کہیں بوڑھا ناراض نہ ہوجائے ۔

دوسرے دن پھر بچی آئی ۔ابھی وہ ڈرین پائپ پر ٹھیک سے بیٹھی بھی نہ تھی کہ لڑکے نے مسکراکر کہا ،''بملا ،آنکھیں بند کر!"

بملانے آنکھیں بند کرلیں ۔کچھ دیر بعد لڑکے نے کہا ، ''اب کھول !دیکھ آج میں نے کیابنایاہے ؟بتاتویہ کس کی مورتی ہے ؟"

بچی کے چہرے پر اتنی حیرت نہ تھی جتنا کہ اس نے امید لگائی تھی ۔بچی تتلاتے ہوئے بولی ،''لگتی تو درگاجیسی ہے ۔لیکن"

بچی غور سے مورتی دیکھنے لگی اورگال پر دایاں ہاتھ رکھ کرشہادت کی انگلی ہلاتے ہوئے کچھ سوچنے لگی ۔لڑکے کا تجسس بڑھ گیا ۔

"لیکن"!

لڑکے نے بڑی بے صبری سے پوچھا ،''لیکن کیا ؟"

"لیکن اس کی ناک میں نتھ اورکانوں میں مندری کہاں ہے ؟ ماتھے پرٹیکا ، گلے میں ہار ، ہاتھ میں چوڑی ، پاوں میں پائل ، بھی نہیں ۔دھت یہ بھی کوئی ماں درگا ہوئی ۔"

اس بار بھی لڑکا اداس ہوگیا ۔اس نے یہ مورت بھی گڑھے میں ڈال دیااسے مٹی میں ملادیا ۔لڑکے کو اداس دیکھ کر بچی نے کہا ،''جب میں بڑی ہوجاوں گی تو میں ناک میں نتھ ، کان میں جھمکے ،ہاتھ میں چوڑی پہنوں گی ۔گلے مینہار ،ماتھے پر ٹیکا ، پاوں میں پائل بھی پہنوں گی ۔"

لڑکا سوچنے لگا ،''جب بملابڑی ہوجائے گی تووہ کس کی طرح دکھے گی ؟ درگا مانکی پرتیما کی طرح ،کالی مائی کی پرتیما کی طرح یا پھر مانسرسوتی کی پرتیما جیسی ؟ کیااس کا کولھا اور سینہ بھی اسی طرح ابھر آئے گا ۔کیااس کاجسم بھی اسی طرح کا ہوجائے گا جیسا باباکو اپنی پرتیماوں کے لیے پسند ہے ۔ نہیننہیں ،وہ پرتیمائیں تو بول نہیں سکتیں ۔ سب کی سب بے جان ہیں ۔ ان میں آتماکہاں ؟ میری بملاتوبولتی ہے ! ٹپ ٹپ بولتی ہے ، مینا کی طرح!!یہ تو زندہ ہے ۔"

لیکن افسوس کہ اس کی مینا زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکی !!

ہوا یوں کہ اس علاقے میں تیزی سے مہاماری پھیلنے لگی !بھادوں کے مہینے میں یہاں اکثر ایسا ہوتاتھا ۔ جب وہ کئی روز تک نہیں آئی تو لڑکے کو فکر لاحق ہوئی ۔وہ اس کے گھر پہنچ گیا ۔ بملابے ست پڑی تھی ۔جسم پر لال لال چٹّے پڑ گئے

تھے۔ لڑکے کودیکھ کراس کے چہرے پرپھیکی سی مسکراہٹ ابھری ۔ لڑکے نے پوچھا ،''بملا ، بڑاکشٹ ہورہا ہے کیا ؟ ''

بملاکچھ نہیں بولی ۔اس نے اثبات میں صرف دھیرے سے گردن ہلادی۔ سرہانے اس کی ماں بیٹھی سر پر پانی پٹّی چڑھارہی تھی ۔ سسکتے ہوئے بولی ، ''کئی دنوں سے بخار لگا ہے۔ اترنے کا نام نہیں لےتا۔ کہتی ہے ،سرمیں بہت دردہے!بدن کاجوڑ جو ڑ دکھ رہاہے!!''

لڑکے سے اس کی حالت دیکھی نہیں گئی۔اس نے دل ہی دل پرارتھناکی ،''اے ٹھاکر ، میری بملاکو اچھاکردے''!!

اس کے بعد وہ روزانہ جانے لگا۔بملاکی ماں نے منع کیا ،''بیٹا ، تواس کے پاس مت جایاکر ۔اسے چھوت کی بیماری ہوگئی ہے۔تجھے بھی ہو جائے گی۔ ''

لیکن لڑکا کب ماننے والاتھا!وہ بملاکی ہتھیلیاں اور تلوے سہلاتا ،سرپرپٹی چڑھاتا۔گھنٹوں اس کے سرہانے بیٹھارہتا۔کہتا ،''بملا ، تو جلدی سے ٹھیک ہوجا۔میناس دفعہ تیری مورتی بناوں گا۔''

لیکن اس کی بملاٹھیک نہیں ہوئی۔اسے قے آنے لگی۔پیٹ میں شدیددرد شروع ہوگیا۔ناک اور منہ سے خون بہنے لگا۔جسم زرد پڑتاگیا۔ لوگوں نے کہا ، ''ڈینگو بخارہوا ہے۔ یہ نہیں بچے گی۔''

اور واقعی وہ نہیں بچی۔ لوگوں کاماننا تھاکہ مہاماری میں مرنے والے بچے کی لاش جلانی نہیں چاہئے۔سچ تو یہ تھاکہ اس کی غریب ماں کے پاس اتنا پیسہ ہی کہاںتھا کہ وہ لکڑیاں خریدتی۔ اپنی بچی کی چتاجلاتی ۔ چنانچہ اس کی لاش نہر کنارے مٹی میں دبادی گئی۔ لڑکا پھر سے تنہاہوگیا۔ اب اس کا جی کسی کام میں

لگتانہ تھا۔بچی کی موت کاصدمہ بوڑھے کو بھی کم نہ تھا ، لیکن وہ اس صدمے کو دل میں دبائے لڑکے کوبہلانے کی کوشش کرتا۔ اس نے ایک بارپھر وہی قصہ چھیڑا:

”چاردوست تھے ۔چاروں نے بھگوان وشو کرما سے پرارتھنا کی۔ اے بھگوان ! ہمیں کوئی انوکھا فن سکھلادے۔بھگوان وشوکرمانے ان کی پرارتھنا سوئیکار کرلی۔ انھیں بارہ برس تک سکھاتے رہے۔وہ بھی پوری جی جان سے سیکھتے رہے ۔ پہلے نے ہڈیاں جوڑ جوڑ کر ڈھانچہ بنانا سیکھا۔دوسرے نے اس پر ماس جمانا سیکھا ، تیسرے نے اس پر چمڑے کا غلاف چڑھاناسیکھا۔“

لیکن اس بار بوڑھے کوخاموش دیکھ کر اس نے اپناسوال نہیں دہرایا۔

اورتب بوڑھے نے کہا ،”آ،میں تجھے ماس جمانااور چمڑے کا غلاف چڑھانا سکھلادوں ۔“

لیکن لڑکا تو کسی اور خیال میں گم تھا۔خاموش کھڑارہا۔

دوسرے دن وہ نہر کنارے اداس بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ پیلی سی ایک چیز پر پڑی۔اس نے غور سے دیکھا ،”کہیں یہ بملاکے پیر کی ہڈی تو نہیں ؟ تو کیا جانوروں نے اس کی قبر کھود کر اس کی لاش کھالی ہے“!!

ہاں ،بملاکی لاش کے ساتھ ایساہی ہواتھا۔اس نے ایک ایک ہڈی ڈھونڈی اور انھیں اٹھاکر لے آیا۔

چاندنی رات تھی۔لڑکے نے آسمان کی طرف نگاہ کی ۔ دور دور تک بادل کانام و نشاں نہ تھا۔چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا ۔ مگر درخت کا ایک پتابھی نہیں ہل رہا تھا۔فضامیں عجیب سی گھٹن تھی۔

وہ کچھ دیر تک ٹکٹکی باندھے چاندکو تکتا رہا۔ بڑھیا چاند میں بیٹھی چکّی پیس رہی تھی۔ پھر اس نے جھونپڑے کی طرف دیکھا۔بوڑھاہر دن کی طرح آج بھی دارو پی کر اوندھا پڑاہوا تھا۔

لڑکا ہڈیانجوڑتاگیااور بڑبڑاتا گیا ، ''پہلے نے ہڈیاں جوڑ جوڑکرڈھانچہ بنایا“!

اورجب ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیاتو لڑکا اس ڈھانچے پر مٹی تھوپتاگیااور بڑبڑاتا گیا ،''پہلے نے ہڈیاں جوڑ جوڑ کر ڈھانچہ بنایا ، دوسرے نے ماس جمایا!“

اب وہ مورتی کوہتھیلیوں سے لیپ رہا تھا اور بڑبڑاتا جارہا تھا ، ''پہلے نے ہڈیاں جوڑ جوڑ کر ڈھانچہ بنایا ،دوسرے نے ماس جمایا ، تیسرے نے غلاف چڑھایا“

-پانچ -

پوَپھٹ چکی تھی۔فضامینگھٹن کااحساس بڑھنے لگاتھا۔ہمیشہ کی طرح آج بھی بوڑھاخوابِ غفلت میں پڑا تھاکہ اچانک اس کے کانوں میں ایک آواز آئی۔ وہ چونک کر جاگ گیا۔

پہلے تواسے یقین ہی نہ ہوا۔اس نے ہتھیلیوں سے آنکھیں ملیں ،کان سہلائے اور اپنے آپ سے کہا ،''نہیں ، یہ خواب نہیں!یہ خواب نہیں ہے ! “

بوسیدہ ڈرین پائپ پر بملاکی پرتیما تھی!! لڑکا پرتیما کے سامنے نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑاتھا۔ بڑبڑاتاجارہاتھا ،“پہلے نے ہڈیاں جوڑ جوڑ کر ڈھانچہ بنایا ، دوسرے نے ماس جمایا ، تیسرے نے غلاف چڑھایا۔پہلے نے ہڈیاں جوڑ جوڑ کر ڈھانچہ بنایا ،دوسرے نے ماس جمایا ، تیسرے نے غلاف چڑھایا“

بوڑھے کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔وہ ڈرتاڈرتاپرتیما کے قریب آیا۔دم بخود کچھ دیرتک اسے دیکھتارہا۔پھر لڑکے کی طرف مڑا۔اسے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا! پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا!!!اوردھم سے اس کے قدموں پرگرپڑا!!!

پرتیما اب بھی بول رہی تھی ،''اور چوتھے نے روح پھونکی! اور چوتھے نے روح پھونکی!!!''

٭٭٭

(ایوانِ اردو ،دہلی ،اگست2008)

مدّوجزر

رات کے آٹھ بج رہے تھے ۔ میں بستر پر اوندھی پڑی تھی ۔ میوزک سسٹم اَن تھا۔ ہلکی ہلکی موسیقی کی لَے پرمیرے پیر تھرک رہے تھے ،پر دل میں ٹیس اب بھی باقی تھی! حالانکہ ہفتے بھر کا وقفہ گزر چکا تھا ۔اس درمیان وہ کئی فون کرچکاتھا۔اپنی غلطی کا اعتراف کر چکاتھا۔ ایک بار تو میرے دل نے چاہابھی تھاکہ اسے معاف کردوں ،لیکن دوسرے ہی پل میں نے جذبات پر قابو پالیا ۔بات ہی ایسی تھی ۔

ویسے سچ کہوں تو اب بھی میں شش و پنج میں تھی ! اسے معاف کردوں یا ہمیشہ کے لیے ناتاتوڑلوں!! میں انہی خیالوں میں الجھی ہوئی تھی کہ ایک بار پھر فون کی گھنٹی بج اٹھی!فون اٹھانے کو میراجی نہیں چارہاتھا ۔ لیکن جب شور حد سے زیادہ ہونے لگا تو قہراً و جبراً میں نے فون اٹھالیااورجھڑک کر کہا ،'' کہا نا! میں تم سے بات کرنانہیں چاہتی!!پھر کیوں بار بار تنگ کر رہے ہو؟“

لیکن دوسری طرف سے جواب آیا۔جواب نہیں بلکہ وہ توایک سوال تھا ،

”اِ ز اِ ٹ مِس گل ناز ؟“

اور تب میرے لہجے میں نرمی آگئی ، ''سوری طلال ،میں نے سمجھا کہ....“

”میں بھی سنوں ، تونے کیا سمجھا ؟“

”چھوڑو ،جانے دو ! بتاوکیسے فون کیا ؟اور آنٹی انکل کیسے ہیں ؟ “

”سب ٹھیک ٹھاک ہیں ۔کل مل سکتی ہو ؟“

’’کل ؟ کہاں ؟“

اسی ملینیم پارک میں ۔“

”کب ؟“

”شام کو ۔“

اوردوسرے دن شام کو ہم دونوں ملینیم پارک کے گیٹ پر ملے ۔ ملتے ہی میں اس کے بائیں بازو سے لپٹ گئی ۔طلال نے مجھے جھٹکا نہیں ، نہ جواباً میرے کندھے پراس نے اپنا ہاتھ رکھا ، بلکہ مجھے محسوس ہواجیسے وہ اپنے آپ میں سمٹتاجارہاہے ۔ہم پارک میں داخل ہوئے ۔تھوڑی دور چلتے رہے ۔میں اب بھی اس کے بازو سے لپٹی ہوئی تھی ۔دیکھنے والے شاید یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم دونوں عاشق معشوق ہیں ۔ لیکن ہمارے بیچ ایسی کوئی بات پیدا نہیں ہوئی تھی ۔اور اس کی گنجائش بھی بھلا کیسے ہو سکتی تھی ۔ ہم اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے ۔کوئی بنچ خالی نظر نہیں آئی ۔ کسی پر بوڑھے ،کسی پر ادھیڑ عمر والے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے ۔ لیکن زیادہ تر بنچوں پر نوجوان جوڑوں کاقبضہ تھا ۔ مجبوراً ہمیں گھاس کے فرش پر بیٹھنا پڑا ۔ بیٹھتے وقت طلال مجھ سے اپنابازو چھڑا نے مینکامیاب ہوگیا ۔اب اس کے چہرے پر راحت کے آثار نمایاں ہوگئے تھے ۔میں اسے بغور دیکھ رہی تھی اوروہ تھاکہ نیلے آسمان پر اڑتے ہوئے سفید سفید اون کے گولے جیسے بادلوں کوتک رہا تھا ۔ جب کچھ وقت گزر گیا تواس نے اسی طرح آسمان پر

نظریں ٹکائے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں کہا ،’’کی رے ،آج کال ،کونو آڈّہ ٹاڈّہ جم چھے نا ؟ (کیارے ،آ ج کل کوئی گپ شپ کی محفل نہیں جم رہی ہے ؟)‘‘

’’نا ،آڈّہ ٹاڈّہ آر بھالو لاگے نا! (نہیں ،اب اڈّہ وڈّہ اچھا نہیں لگتا ۔)‘‘

ہم لوگ بے تکلفی میں اپنے دوستوں سے گاہے گاہے بنگلہ بولتے رہتے ہیں ۔

’’کینو ،کینو ؟ (کیوں ،کیوں)توتواڈّہ مارنے کی شوقین ہے ۔ اچھا ،بتاتو اشہادکے ساتھ تیرا کوئی جھگڑا وگڑا ہواہے کیا ،تو کل فون پر ؟‘‘ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا ۔

’’نہیں ،بس یوں ہی ‘‘میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا ۔

’’دے موبائل ٹا دے تو ،اور ساتھے کتھا بولی ۔ (دے موبائل دے تو ، اس سے باتیں کروں ۔) اسے سمجھانے کی کوشش کروں ۔‘‘

’’نہیں ،میرے پاس اس کا نمبرنہیں ہے ۔چھوڑو ،بولو کی کھابے ،چا ،ناکوفی ؟ (کہو ،کیا پیوگے ،چائے یا کافی ؟)‘‘ میں ٹی اسٹال کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ۔

’’کچھ نہیں ،گھرسے چلتے وقت ماں نے زبردستی چائے پینے کو کہاتھا ،اس لیے چائے پی کرآناپڑا ۔تو بتا ، کیاپیئے گی ؟‘‘

’’نہیں ، ابھی نہیں بعد میں !!آنٹی تمہیں بہت پیار کرتی ہے نا ؟ ‘‘ میرامقصد بات کارخ موڑناتھا ۔

’’ارے ، ماں ہے! وہ نہیں کرے گی تو ،کے کوربے ؟(کون کرے گا ؟)‘‘ اس نے اپنے انداز میں سر اورہاتھوں کو جنبش دیتے ہوئے کہا ۔

’’کینو ،انکل ،انکل تمائے بھالو باسین نا ؟ (کیوں ، انکل ؟ انکل تمہیں پیار نہیں کرتے ؟)‘‘

”کرتے ہیں ،وہ بھی کرتے ہیں! لیکن ؟“اس کی گفتگو میں اس کا مخصوص انداز اب کچھ زیادہ ہی شامل ہو نے لگاتھاجومجھے بڑا دلکش لگتاتھا۔

”لیکن کیا؟“میں اسے اکسانا چاہتی تھی اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہی۔

” ارے ،باپ پہلے مرد ہوتاہے ،پھر باپ ،ابّویاپاپا!“

جب وہ کسی موضوع پر باتیں کرتاتھا تو کسی فلسفی سے کم نہیں لگتا تھا۔اس کی باتوں میں گہرائی ،گیرائی ،منطق ،جواز سبھی سمٹ آتے تھے ۔ اور سچ کہوں تو اس کی اکثر باتیں میرے سر کے اوپر سے گزرجاتی تھیں۔ پھر بھی مجھے کبھی کوئی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی ۔ بلکہ اچھا لگتا تھا۔اسی لیے میں اکثر اسے گفتگو کرنے پر اکساتی رہتی تھی۔ سو اس بار بھی اکسایا ، ''توپھر عورت کو بھی پہلے عورت ،پھر ماں ،امّی یاممّی ہوناچاہیئے !کیوں ؟“

طلال مزید سنجیدہ ہوگیا۔ دو تین بار شہادت کی انگلی سے کنپٹی پر ٹھوکادیااور بولا ، ''ہوں ں ں تیری بات میں دم ہے“!

میں نے طلال کی نقل اتارتے ہوئے نون غنہ کو ضرورت سے کچھ زیادہ کھینچتے ہوئے کہا ، ''ہوننں ، پہلے نہیں تھا ۔ اب ہوگیا ہے۔ تم سے ملنے کے بعد!“

اور ہم دونوں ہنسنے لگے ۔

طلال نے موضوع بدلا ،''لیکن تو نے بتایانہیں ،اشہاد سے ؟“

” کیابتاوں ؟“ میراپارہ چڑھنے لگا ،“یہی کہ وہ مجھے انسان نہیں ، چیز سمجھتاہے۔ میں اسے دل وجان سے چاہتی ہوں اوروہ سبھوں سے کہتاپھرتاہے کہ دیکھ ،میں نے کیا چیز پھانسی ہے! کیااس کی نظر میں میری یہی وقعت ہے !!!ایک چیز ،ایک شے!!چھی ،وہ ایسا اوچھاخیال رکھتاہے میرے بارے میں!!!“

طلال خاموش رہا۔ نظریں نیچی کیے پیر کے انگوٹھے سے مٹی کریدنے لگا۔کچھ دیر بعد دبے لہجے میں گویاہوا ، "دیکھ اس میں اشہاد کا قصور نہیں!مرد توعورت کو محض ایک شے ہی سمجھتا ہے ۔مردکے معنی ہے Sense of Possession ہر شے پر مالکانہ حق ! اور مردانگی اس مالکانہ حق کو بحال رکھنے کا ہتھیا رہے Mere an instrument of domination. A pliable tool of exploitation.اور جب مرد کو یہ احساس ہونے لگتاہے کہ اس کایہ ہتھیار اس کے ہاتھوں سے پھسلتاجارہاہے تو وہ بوکھلا اٹھتا ہے۔" طلال نے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اپنے چہرے پر بکھیرتے ہوئے کہا ،" اور اس بوکھلاہٹ میں وہ اپنا مکھوٹا نوچ پھینکتاہے۔ اور تب اس کا اصلی چہرہ سامنے آجاتا ہے۔"

"اور میں نے اشہاد کاوہ اصلی چہرہ دیکھ لیاہے !!''میں نے حقارت سے کہا۔

"لیکن میرے خیال میں صرف مردوں کو قصوروار ٹھہراناٹھیک نہیں۔اس میں عورتیں بھی برابرکی حصہ دار ہےں۔"

"عورتیں! برابر کی حصہ دارہیں!'' میں نے پیشانی پر شکن ڈال کرپوچھا ، "وہ کیسے ؟"

"وہ ایسے کہ عورتوں میں بڑاتضادہوتا ہے !!''طلال نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"تضاد !کیساتضاد ؟''میں نے اپنی ٹانگیں آگے اور ہاتھ پیچھے کی جانب پھیلاکر ہتھیلوں پر ٹیک دیتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

اور پھر اس نے اپنافلسفہ بگھارنا شروع کیا ،'' عورتیں ایک طرف فیمنزم ، وِمنس رائٹس ، وِمنس اکوالیٹی کانعرہ لگاتی ہےں تودوسری طرف باپ ،شوہراور بیٹے سے تحفظ کی طلب گار بھی بن جاتی ہےں۔ They are totally confused ہر وقت کنفیوژن میں رہتی ہےں۔ اور مرد ان کے اس کنفیوژن سے فائدہ لوٹتے ہےں ۔"

”وہ کیسے ؟“میں نے طلال کی آنکھوں میں جھانکا۔ اب دھیرے دھیرے میرا غصہ اترنے لگا تھا۔میں غور سے اس کی باتیں سننے لگی۔

”میاں بیوی دن بھرایک ہی دفتر مینشانہ بشانہ کام کرتے ہیناور ساتھ گھر لوٹتے ہیں۔گھرآکرمیاں صوفے پر پھیل جاتاہے اور بیوی رسوئی میں گھس جاتی ہے ۔ دفتر کے رفیق ِکار گھرآتے ہی حاکم محکوم بن جاتے ہیں۔لیکن جب وہی عورت باہر آتی ہے تو چیختی ہے ، چلاتی ہے ، نسائی آزادی اور حقوقِ نسواں کی دہائی دیتی ہے ۔یہ تضاد نہیں تو اور کیا ہے ؟ گھر میں ماں کے مقابلے باپ کا زیادہ خیال رکھتی ہے۔بیٹی کے مقابلے بیٹے کا مستقبل اسے زیادہ ستاتاہے ۔گھر میں رکشا بندھن ،بھائی پھوٹا بڑے چاوسے مناتی ہے اور باہر آکرمردوں کے جبر وتشدد کے خلاف گلا پھاڑنے لگتی ہے۔بتا ،یہ تضاد نہیں توکیاہے ؟“

”تو تم یہ کہناچاہتے ہو کہ مردوں مینتضاد نہیں ہوتا! باپ بھی تو بیٹی کو زیادہ چاہتا ہے۔ یہ تضاد نہیں ہے ؟“

”ارے دیکھ گل ناز ، میں کوئی ماہرِ نفسیات نہیں اور نہ اس وقت فرائڈ کی کسی تھیوری پربحث کرنے کا میرا من ہے۔میں تو بس حقیقت بیان کررہا ہوں۔“

”میں بھی فرائڈ کی تھیوری نہیں بگھارہی ہوں ،میں تو صرف یہ پوچھ رہی ہوں کہ مردوں میں تضادہوتاہے یا نہیں ؟“یہ کہہ کر میں نے اپنی ٹانگیں اوپر کی جانب موڑئیں اور ہتھیلیاں مقفل کرکے گھٹنوں کوجکڑ لیا ۔ طلال کی نگاہیں میری نیم عریاں ٹانگوں پر آٹکیں ، مگر میں نے اس کی پرواہیں کی۔

وہ نگاہیں ہٹائے بغیر ہی گویاہوا ،”ہوتاہے۔ لیکن وہ اس تضاد میں بھی اپنا فائدہ ڈھونڈ نکالتے ہےں۔مرد ظالم اور جابر ہیں ،لیکن ہوشیار اور عیار بھی کم نہیں! فوراً نسائی آزادی ، حقوقِ نسواں اور تانیثیت کے علم بردار بن جاتے

ہیں ۔نسائی آزادی کا جھانسادے کر عورتوں کو رئمپ پر عریاں کیٹ واک کراتے ہیں ،اور مسرور ہوکر تالیاں پیٹتے ہیں ، تانیثیت کاشور مچا کر انھیں بے راہ روی پر ورغلاتے ہیں ،اوراپنی ہوس پوری کرتے ہیں ۔ حقوقِ نسواں کے نام پر کارخانوں اور دفتروں میں اپناہم نشیں بنا تے ہیں تاکہ ان کا معاشی اورجنسی استحصال کرسکیں اور عورتیں یہ بھول جاتی ہیں کہ چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر ، کٹتا تو خربوزہ ہی ہے ۔ مگر مرد یہ بات کبھی نہیں بھولتے ۔ انھیں تو پتہ ہے ، چت بھی ان کی اور پٹ بھی ان کی ۔"

" ارے طلال ،تم کیافیمنسٹ ہو ؟وہ کیاکہتے ہیں ناری وادی!!'' میری رگِ شرارت پھڑکنے لگی تھی ۔لیکن طلال ہنوز سنجیدہ تھا ۔ رخساربکف گھڑی بھر مجھے تکتا رہا ۔ پھر سر ہلاکربولا ، "نہیں رے گل ناز ، میں ناری وادی ہوں ، نہ پرش وادی ! میں تو ناری واد اور پُرش واد کے درمیان پساجانے والاایک وِواد ہوں!عورتیں تحفظ کے نام پر خود سپردگی کرتی ہےں اور مرد انھیں استعمال کرتے ہےں ، انھیں تفریح کاسامان بنالیتے ہےں ۔ اور چونکہ ہم جیسے لوگ ان کے استعمال کے لائق نہیں ، اس لیے وہ ہمیں محض تفریح کا سامان سمجھ کر ہم پر ہنستے ہےں ،ہمیں لعن طعن کرتے ہےں ۔"

اورپھر طلال نے چپی سادھ لی ۔ بانہیں پیچھے کیں اورسر اٹھائے آسمان کی جانب دیکھنے لگا ۔سفید اون کے گولے آہستہ آہستہ دور بہت دور جاچکے تھے ۔ اب آسمان صاف اور پوری طرح نیلا ہوچکاتھا ۔ ہمارے درمیان کافی دیر تک خاموشی حائل رہی ۔ آخر کار مجھے ہی خاموشی توڑنی پڑی ۔ میں نے سنجیدگی سے پوچھا ،''ایک بات کہوں ، طلال ،براتو نہیں مانو گے ؟"

"نہیں رے ،ہم کسی بات کا برانہیں مانتے ۔اگر برامانتے تو گھر سے باہر ہی نہ نکلتے ،چاردیواری کے اندر بیٹھے ہروقت اپنے ہونے کو کوستے رہتے ۔ لیکن ہم

ایساکیوں کریں ؟ بے وقوفوں کی طرح بھلے برے کے چکر میں پڑ کر کیوں اپنا خون پانی کریں ؟ہم تو بس جینا چاہتے ہیں ،اور جئینگے ،اپنے طورپرجئیں گے !!"

"ہاں میں نے تمہارے اندر زندگی کی رمق دیکھی ہے -وہ رمق جو عام آدمیوں کو میسر نہیں -سچ پوچھو تو ، تمہاری اسی رمق نے مجھے بھی جینے کی ایک نئی راہ دکھائی ہے -اور شاید اسی لیے میں بھی اپنے چہرے سے جھوٹ کانقاب نوچ کرپھینک دیناچاہتی ہوں -"

طلال نے مسکراتے ہوئے کہا ، ''ارے بابا ، صرف ڈائلاگ مارتی رہے گی ، یا کچھ بتائے گی بھی -بتاتوکیا کہنا چاہتی تھی -'' اسی دوران مینکئی جوڑے ہمارے آس پاس آکر بیٹھ گئے - طلال نے ادھرادھر دیکھا اور کہا ،'' چل ، کشتی میں بیٹھتے ہیں - "

ہگلی ندی کا یہ کنارا کبھی یوں ہی بے کار پڑا تھا - کیچڑ اور گندگی سے اٹا رہتا تھا - اب اسے صاف کرکے پارک کی شکل دے دی گئی ہے - ظاہر ہے ایسے پارک کی لمبائی چوڑائی کے مقابلے زیادہ ہوتی ہے -دو ٹکڑوں پرمشتمل اس پارک کے درمیانی حصے میں اب بھی دریا کی سیر کے لیے کشتیاں حاضر رہتی ہیں - ہم دونوں اس جانب چل دیئے -ایک کشتی میں سوار ہوگئے - سوار ہوتے وقت کشتی ڈولنے لگی تھی - میں نے پاوں پیچھے کھینچ لیے - تب طلال نے اپنا مضبوط ہاتھ بڑھایااور ایک ہی جھٹکے میں مجھے کشتی پرلے آیا - ندی چڑھی ہوئی تھی - پانی کابہاوجنوب سے شمال کی جانب تھا -پولی تھین کی تھیلیاں ، پھول کی مالائیں ، پوال کی گانٹھیں ،بانس کی ٹھٹریاں ، آبی پودے تیزی سے بہے جا رہے تھے - مسافروں اور اسباب سے لدے لانچ اور ، اسٹیمر اپنی اپنی منزل کو رواں دواں تھے - سیرسپاٹا کرانے والی کشتیاں بیچ ندی میں ڈول رہی تھیں - موجیں کناروں پر تھپیڑے لگا رہی تھیں اور جب کوئی اسٹیمر یالانچ تیزروی سے گزرتاتھاتو تھپیڑوں کازورمزید بڑھ جاتاتھا - ہماری

کشتی دھیرے دھیرے کنارے سے دور ہوتی جارہی تھی ۔ ہوا کے جھونکے ہمارے بدن کو گدگدانے لگے تھے ۔میں ندی کے گدلے پانی مینہاتھ پھیرنے لگی ۔ طلال کے جسم پر دوچار چھینٹے بھی ڈالے ۔ طلال نے دونوں ہتھیلوں کوڈھال بناکر روکتے ہوئے اپناسوال دہرایا ، ''اچھا بتا ،تواس وقت کیابک رہی تھی ؟ "

میں نے پُرشوخ لہجے میں کہا ، ''طلال ،امار بھوئے کورچھے ۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے ۔ کہیں تم ناراض نہ ہوجاومجھ سے نفرت نہ کرنے لگو ۔ "

"تار مانے بےپار ٹی خوب ای سیریس ؟(اس کا مطلب ہے کہ معاملہ بہت سریس ہے ؟)"

"پہلے سریس نہیں تھا ، اب ہوگیا ہے ۔"الفاظ میرے حلق میں پھنسنے لگے ۔ لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری ،کہتی گئی ، "پہلے تویہ ایک کھیل تھا ۔ حماقت آ میز کھیل! ایک احمقانہ چیلنج!! مگر اب یہ چیلنج میرے لیے وبالِ جاں بن چکا ہے ۔ ایک زہریلا ناگ بن کر اندر ہی اندر مجھے ڈس رہاہے ۔میری روح کومجروح کررہاہے ۔ اور سہا نہیں جاتا ۔ طلال ، اب تم ہی مجھے اس سے نجات دلاسکتے ہو ۔ مجھے نجات دلاوپلیز ۔میری مدد کرو ، طلال ، پلیز ۔'' اتنا کہہ کر میں نے اس کاہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا ۔

"گل ناز ، توکیا بک رہی ہے ،مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے ۔ تواس قدر جذباتی کیوں ہورہی ہے ۔میں نے کہانا ، ہم کسی بات کا برانہیں مانتے ! تو بے فکر ہو کر کہہ ، تجھے جو کہناہے ۔"

"نہینپہلے وعدہ کرو ،تم مجھ سے ناراض نہیں ہو گے ؟''میں نے اس کا ہاتھ جھنجوڑتے ہوئے پوچھا ۔

"اچھا بابا ،چل ۔ میں وعدہ کرتاہوں ۔اب بتا ۔'' یہ کہہ کراس نے اپنے سرسے میرے سر پر ہلکی سی ایک ٹکّرماری ۔

"چھ مہینے پہلے کی بات ہےطلال ،میں نے اپنے دوستوں سے شرط لگائی تھی ۔''

I took it as a challengeمیرے لہجے میں فخروانکسار کی آمیزش تھی ۔

"کیسا چیلنج ؟"اس نے گردن جھکا کر پلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا ۔

"تمہینمرد بنانے کا !'' میں نے اپنا مدعا ایک ہی سانس میں بیان کرڈالا۔

"مجھے مرد بنانے کا !!''طلال ٹھٹھامار کر ہنسنے لگا ۔اس کے لحیم شحیم جسم میں جیسے بھونچال آگیاتھا ۔ملاح بھی چونک کردیکھنے لگا ۔طلال نے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا ، ارے باپ رے ،یہ تو واقعی بہت بڑا چیلنج ہے ، گل ناز ،تو نے اتنا بڑا چیلنج قبول کیسے کر لیا ؟"

میں نے یقین دلانے کی کوشش کی ،''طلال ،اس وقت میں بھی تمہارے ظاہرہی کو تمہارا سب کچھ سمجھتی تھی ۔تمہیں دیکھتے ہی ٹھٹھولیاں کرنے کومیرا بھی جی چاہتاتھا ۔ لیکن جب تمہیں قریب سے دیکھا ،تو رفتہ رفتہ میرا نظریہ بدلتاگیا ۔ تمہاری خوبیاں مجھ پرظاہر ہوتی گئیں ۔ شیشے کی طرح شفاف دل ، نہ کینہ نہ میل!!صاف ستھرے خیالات ، کوئی الجھاونہیں ۔ صاف گوئی ، بے ضرر ، بے غرض !! دنیاتمہاری جنس کولے کرالجھن میں ہے اور میں تمہاری خوبیاں کولے کر کشمکش میں ہوں ۔ عورت نمامردکوچاہوں یا مرد نما عورت سے پیار کروں ۔ یااس مرد سے جو تحفظ کے نام پرمیرے وجودکو اپنی ملکیت سمجھتاہے ۔"

"نہیں ،پاگل مت بن ،گل ناز ۔تو اشہادسے پیار کرتی ہے ، وہ بھی تجھ سے پیار کرتا ہے ۔دے مجھے موبائل دے ،میں اس سے بات کرتا ہوں ۔"

"اس کانمبر میں نے ڈلیٹ کردیاہے ! میں اس سے ملنانہیں چاہتی۔ مطلبی ہے وہ۔ ''میراپارہ پھر سے چڑھنے لگا۔

"لیکن وہ مرد ہے ،ہینڈ سم ہے۔ سینس آف ہیومر بھی اچھا ہے۔ تجھے چاہتا بھی ہے۔ پیار کرنے کے لیے ایک عورت کو اوربھلاکیا چاہیئے ؟ اورپھر تجھے بھی تو اس کی یہی خوبیاں بھاتی ہیں۔"

"پہلے بھاتی تھیں ، طلال ، بہت بھاتی تھیں ، اب نہیں بھاتیں۔ تم نے میرا نظریہ بدل دیا ہے۔ اب مجھے اشہاد اچھانہیں لگتا ۔ اس کی مردانگی ، اس کا ہینڈسملی لُک ، اس کا سینس آف ہیومر ،سب میرے لیے بے معنی ہو چکاہے ۔"

"تو پھرتیرے اس چیلنج کا کیاہوگا ؟ کیاتوہارمان جائے گی ؟"

"نہیں اب کوئی چیلنج نہیں ،کوئی جیت نہیں ،کوئی ہار نہیں! صرف پیار!!''مجھ پر جیسے جنون سوار ہونے لگاتھا۔

"پیار! کیسا پیار ؟میرامطلب ہے وہ پیار جو عورت عورت سے کرتی ہے یاوہ پیار جو عورت مرد سے ؟''وہ مجھے نارمل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔اور جاننابھی نہیں چاہتی ہوں۔میں توصرف اتناجانتی ہوں کہ میں تم سے پیارکرنے لگی ہوں۔ بولو ، کیاتم مجھ سے پیار نہیں کرتے ؟''میرا جنون بڑھتا گیا۔

"ہاں کرتاہوں۔مگرصرف وہ پیار جو انسان انسان سے کرتاہے یا اسے کرنا چاہیئے۔ ''طلال نے مجھے جھنجوڑ تے ہوئے کہا۔

”طلال ،میں تم سے پیار کی تشریح نہیں ، پیار مانگ رہی ہوں۔ مجھے پیار کرو ۔ طلال ، آمائے بھالو باسو۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے طلال کے گرد اپنی بانہوں کی گرفت مضبوط کرلی۔ خود سپرد گی پربھی آمادہ ہوگئی تھی۔

لیکن اچانک میں نے محسوس کیا کہ طلال کے لہجے مینترشی آگئی ہے ،''پیار کروں! مرد بن کر!!“

”ہاں طلال ،مردبن کر!طلال تم مرد بن جاو“ میں اصرار کرتی گئی۔

ملاح نے گردن موڑ کر ترچھی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ ہونٹوں میں دبی ہوئی بیڑی کا ایک لمبا کش لےااوربچے ہوٹکڑے کو ندی میں تھوک کر ، مسکراتاہواہولے ہولے پتوار کھینچنے لگا۔

طلال خود کومیری گرفت سے آزاد کراتے ہوئے بولا ،''میری ماں بھی یہی چاہتی ہے ،اور جب بھی وہ اپنی اس چاہت کا اظہار کرتی ہے ، تو میں اس سے پوچھ بیٹھتا ہوں ۔ ماں ،مجھے مرد بناکر تو اپنی کس خواہش کی تکمیل چاہتی ہے ؟ اورمیرے جواب سے وہ اداس ہو جاتی ہے۔ آنکھوں میں آنسوبھر کر کہتی ہے ، بیٹا ، میری تمنا ہے کہ جیسے دوسرے لوگ سماج میں سراٹھاکر زندگی گزارتے ہیں ، تو بھی ویسے ہی سر اٹھاکر زندگی گزارے ۔ اور میں اسے سمجھاتا ہوں ،نہیں ماں ،زندہ رہنے کامقصد دوسروں کی تقلید نہیں ،بلکہ اپنے طور پر جینا ہے ۔ میں بھی سر اٹھا کر جینا چاہتا ہوں ، اپنے طریقے سے ۔“

”طلال ،تمہاری یہ فلسفیانہ باتیں میرے پلّے نہیں پڑنے والی ۔میں تو صرف یہ سمجھتی ہوں کہ تمہاری ماں ٹھیک کہتی ہے ۔تمہیں مرد بن جانا چاہئے۔'' میں نے بانہیں اس کی گردن میں ڈالتے ہوئے کہا ،''ہاں طلال ، تمی پُرش ہوئے دانڑاومرد بن جاواپنی ماں کی خاطر ،اس سماج کی خاطر ،میری خاطر۔“

”تاکہ تو اپنا چیلنج ‘‘طلال کہتے کہتے رک گیا۔

”نہیں اب کوئی چیلنج نہیں ،کوئی جیت نہیں ،کوئی ہار نہیں ، صرف پیار!اور کچھ نہیں !! طلال ، مجھے پیار کرو۔‘‘ میں اسے بانہوں میں بھرکربھینچنا چاہتی تھی۔

طلال نے میراارادہ بھانپ لیا۔مجھے نصیحت کرتے ہوئے بولا”نہیں ،گل ناز تیرا یہ پیار فریب ہے!ہوس ہے !!جنسی بھوک ہے۔“

میں نے اعتراضاً بانہیں اس کی گردن سے ہٹالیں اور کہا ، ”طلال ،خداکے واسطے میری محبت کو گالی نہ دو۔میں سچ مچ تم سے پیار کرنے لگی ہوں۔“

طلال کچھ دیر خاموش رہا۔اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ وہ کبھی اُس کنارے کو تکتاتھا ،کبھی اِس کنارے کو۔ اس کے بعد دائیں ہاتھ کی انگلیاں ہتھیلی کی جانب موڑکر ناخنوں پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا ،”تو مجھ سے سچ مچ پیار کرتی ہے ؟“

میں نے فوراً سر ہلاکر ہامی بھری ۔

اس نے گمبھیر لہجے میں کہا ،”توپھر وعدہ کر کہ مجھے کبھی مردبنانے کی کوشش نہیں کرے گی!! وعدہ کرکہ مجھے ویسے ہی قبول کرے گی جیسا مینہوں۔“

اور تبھی ایک ہچکولا اٹھا۔کشتی ڈگمگا گئی۔

میں نے دیکھا ،پولی تھین کی تھیلیاں ،پھول کی مالائیں ، پوال کی گانٹھیں ،بانس کی ٹھٹریاں ،آبی پودے جو کچھ دیر پہلے شمال کی جانب بہہ رہے تھے ،اب جنوب کی جانب بہنے لگے ہیں۔

پانی کے بہاوکا رخ بدل چکاتھا ! ندی اترنے لگی تھی !!!

٭ ٭ ٭

(ایوانِ اردو ،دہلی ،اگست 2010)

انفکشن

روزانہ کی طرح آج بھی پروفیسرگھوش رینگتے ہوئے آئے ۔چشمہ اتار کر میز پر رکھا ۔دھوتی کے کونچے سے پیشانی اور چہرے کاپسینہ پونچھا ۔ کرسی پکڑ کردوچار لمبی لمبی سانسیں بھریں ۔چاک اٹھاکر کلاس میں موجود طالب علموں پر ایک سرسری نگاہ دوڑائی ۔ بلیک بورڈپر آج کا ٹاپک Revolution and it's Techniquesلکھااور شروع ہوگئے ۔

وہ لکچر دے رہے تھے اور میں آنکھیں پھاڑے ان کامنہ تک رہی تھی۔ سوچ رہی تھی ، ''یہ آج ان کے دانتوں کوکیاہوگیا ؟رہ رہ کر اتنے لمبے اور نوکیلے کیوں ہوجارہے ہیں ؟ ''

اور اس کے ساتھ ہی میری نظروں کے سامنے مرلی کا چہرہ پھرنے لگا ۔ اس کے دانت بھی ایسے ہی لمبے اورنوکیلے ہیں!!ایک دم ڈراکیولا جیسے ! کبھی کبھی تو میں شرارت سے کہہ دیتی تھی ،''خبردار ،یہ دانت کسی کی گردن میں نہ چبھونا ورنہ وہ بھی تمہارے جیساہوجائے گا۔ میں نے فلموں میں دیکھاہے ،ہاں!!"

اور وہ مسکراتے ہوئے کہتا ،''ہاںہاں ،میں نے بھی دیکھاہے ۔ جب ڈراکیولا اپنے تیز نوکیلے دانت کسی لڑکی کی گردن میں چبھودیتا ہے ، تو وہ بھی ڈراکیولا بن جاتی

ہے ، لیڈی ڈراکیولا!! اس کے بھی چاروں دانت یہ لمبے لمبے ، تیز ،اور نوکیلے ہوجاتے ہیں۔ لال لال ، خون میں ڈوبے ہوئے!"

اور مینروٹھ جاتی ۔اس کی چھاتی پر مکّے بر سانے لگتی ۔ وہ مجھے بانہوں میں جکڑ لیتا ۔میرے ہونٹ پراپنے ہونٹ دھر دیتا۔

میں اپنی زبان اس کے دانتوں کی نوک پر باری باری مس کرنے لگتی ۔ کبھی دائیں بائیں ، آگے پیچھے ہلاکر گدگداہٹ سے لطف اندوز ہوتی۔نس نس مینسنسناہٹ محسوس کرتی ۔ کبھی ہلکے ہلکے دباکر میٹھی میٹھی چبھن اور کبھی دبا کر ٹیس اور جلن کا مزہ لیتی ۔سچ تو یہ ہے کہ اس وقت مجھے اس کے دانت اور بھی پیارے لگتے تھے ۔

پروفیسرگھوش لیکچردے رہے تھےمارکسزم ،لینن ازم ، شوسلزم ، ماوازم ، Revolution ، Contradiction ، Struggle of Oppositesاورنہ جانے کیا کیا بکے جارہے تھے ۔ اور میں تھی کہ ان کے نوکدار دانتوں پر نظریں ٹکائے ماضی کی کڑیاں جوڑتی جا رہی تھی ۔

-دو-

ہم دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے ۔وہ تھرڈ ائیرمینتھا ، میں فرسٹ ائیر میں۔

وہاں سے بی اے کرنے کے بعد مرلی یہانچلاآیا۔ ایم اے کرنے۔ شروع شروع تو مجھ سے ملنے جاتا تھا۔ دوچار چٹھیاں بھی بھیجیں ۔لیکن دھیرے دھیرے یہ سلسلہ بھی منقطع ہوگیا ۔

میں بھی بی اے پاس کرلینے کے بعد ایم اے کرنے یہاں چلی آئی۔

یہاں آکر میری ملاقات پرابی سے ہوئی ۔ہم دونوں ایک ہی ہوسٹل میں رہتے ہیں ، ایک ہی کمرے میں ۔ اس اجنبی شہر میں وہی میری دوست ہے اور وہی میری ہمراز۔ ایک دن میں نے اس سے مرلی کا تذکرہ کیا تو وہ میری مدد کو تیار ہوگئی۔ اسی نے یہ سراغ لگایاکہ مرلی گاہے گاہے اسٹوڈینٹ یونین کے دفتر میں آتاہے۔ ہم روزانہ یونین کے دفترکا چکر کاٹنے لگے۔ وہاں گھنٹوں بیٹھے اس کی راہ تکتے رہے ۔ بالآخر میری امید برآئی۔ایک دن مرلی آیا۔ہراساں ،پریشاں ، الجھاالجھا سا !!مجھے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ دو قدم پیچھے ہٹا۔ پھر ہچکچاتا ہواآگے بڑھا۔ قریب آیا۔ میرا ہاتھ دبوچ کر کھینچتا ہوامجھے پاس والے پارک میں لے گیا۔

میں سسکیاں بھرتی رہی ،وہ بہانے تلاشتارہا ۔بے کسی ،بے روزگاری کا راگ الاپتا رہا۔مجھے سمجھانے ،پھسلانے کی کوششیں کرتا رہا۔

اس کے بعد سے ہم اسی پارک میں ملنے لگے ۔مگر مجھے اکثر ایسالگتا تھا کہ وہ کسی گہرے سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ محبت کااظہار کم ، کسان ،زمین ،ظلم ،تشدد ، اور استحصال کی باتیں زیادہ کرتا ہے ۔ رہ رہ کرانقلابی نظریہ بکھاننے لگتا ۔اور جب وہ اپنے انقلابی نظریے کی بکھان کرتاتو اس وقت مجھے محسوس ہوتا تھاکہ اس کے دانت پہلے سے کہینزیادہ تیز ، نوکیلے اورلمبے ہوگئے ہیں ۔

اورایک دن جب میں اس کے اس بدلاوسے عاجز آگئی تو میں نے اسے پکڑکر اپنی طرف کھینچ لیا۔ بانہوں میں بھر کر بھینچنے لگی۔اس کے منہ پراپنا منہ رکھ دیا۔ اس کے ہونٹ چوسنے لگی ۔ مگرجوں ہی زبان اس کے دانت کی نوک پررکھی کہ مجھے زوروں کی چبھن محسوس ہوئی ۔اور اس سے پہلے کہ وہ دانت میری زبان میں دھنس جاتے ،میں نے جلدی سے اپنی زبان باہرنکال لی۔لیکن تب تک میرا جسم پوری طرح اس کی گرفت میں آچکا تھا۔ اب وہ مجھے سینے سے چمٹائے میری گردن

چوم رہا تھا ۔میں کسمسارہی تھی ۔پھر دفعتاًمجھے ایسالگا کہ اس کے دانت میرے جسم میں پیوست ہو رہے ہیں ۔

میں نے پوری طاقت سے اسے جھٹکا ۔وہ تلملاتا ہوا پیچھے سرک گیا ۔اب وہ سامنے کھڑادانت نکالے ہنس رہاتھا ۔ میں نے دیکھا ، اس کے چاروندانت ڈراونے لگ رہے تھے !!

-تین -

پروفیسرگھوش اب بھی لکچر دے رہے تھے ،'' اسٹالین کا کہنا ہے کہ سوشلزم کے قائم ہوتے ہی کلاس وار ختم ہوجائے گا ۔ ماوکا ماننا ہے کہ سوشلزم کے قیام کے بعد بھی کلاس وار چلتا رہے گا ''

ویسے بھی اس وقت میرا ذہن اس طرح کی ردّوقدح کا متحمل نہ تھا ۔ کون کیا کہتا ہے اور کس کا کیا ماننا ہے ، کس کے قیام کے بعد کیا ختم ہوجائے گا اورکس کے خاتمے کے بعد کیاباقی رہ جائے گا ، ان باتوں سے بھلا مجھے کیا سروکار ؟ میں تو پروفیسر گھوش کے لمبے نوکیلے دانت کے بارے میں سوچ رہی تھی ،جو دھیرے دھیرے خوفناک صورت اختیار کرتے جارہے تھے ۔ مرلی کے دانتوں سے بھی زیادہ خوفناک!

میں سراسیمہ انہیں گھور رہی تھی ۔

پرابی نے کئی بار مجھے ٹہوکا بھی دیا ۔ لکچر نوٹ کرنے کا اشارہ کیا ۔ لیکن میں اپنی جگہ خاموش بیٹھی رہی ۔نظروں کے سامنے پروفیسر گھوش کا چہرہ تھا اور ذہن کے پردے پرمرلی کی تصویر ۔

مرلی پھر سے غائب ہوگیاتھا ۔ تین ماہ ہونے کو آئے تھے ۔اس کا کوئی اتاپتا نہیں ۔

اور پھرمیں نے کھاتاقلم بیگ میں رکھے اور ، دبے پاوں کلاس سے باہرنکل آئی۔ کندھے سے بیگ جھلائے تیز تیز قدموں سے پارک کی جانب بڑھنے لگی ۔ شام ہوچلی تھی ، مگر اب بھی دھوپ کی تپش اورپیچ کی سڑک سے اٹھنے والی لہروں سے بدن جھلس رہا تھا۔ گرم ہوا ناک کے راستے جسم میں پیوست ہو رہی تھی ۔ پھیپھڑوں اور سانس کی نلی کو بھپکا رہی تھی ۔ مگرمیں تھی کہ مرلی کی دھن میں مگن گنگناتی ، مسکراتی ،غم کھاتی چلی جارہی تھی۔

پسینے میں شرابورپارک کے مین گیٹ کے سامنے والے گھنےرے درخت کے نیچے آ کر کھڑی ہوگئی۔ رومال سے چہرے اور پیشانی پر جمے پسینے کی بوندیں پونچھنے لگی۔ابھی پسینہ پوری طرح خشک بھی نہیں ہوپایاتھاکہ دو آدمی میرے دائیں بائیں آکھڑے ہوئے ۔ میں سہم گئی ۔خوف وتحیر سے انھیں دیکھنے لگی۔ بائیں طرف والا آدمی لانبے قدکاتھا اور دائیں طرف والا گوراچٹّہ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا۔ اس کی پلکیں بھی سکڑی ہوئی تھیں۔ لانبا آدمی جس کا بایاں کندھا ذرا جھکا ہوا تھا ، نرم لہجے بولا ، ’’مس نینا ، ہم پولس والے ہیں ۔ آپ کو ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہوگا ! ایک تفتیش کے سلسلے میں ، مرلی ہیمبرم کے بارے میں۔‘‘

”مرلی کے بارے !!‘‘میں ابھی اپنی بات پوری بھی نہ کرپائی تھی کہ کالے رنگ کی ایک سومو کار سامنے آکرکھڑی ہوگئی ۔اندر ایک فربہ اندام خاتون بیٹھی تھی ۔

”پلیز ،مس نینا۔‘‘لانبے آدمی نے مجھے اشارے سے کار میں بیٹھنے کو کہا۔

۔چار۔

کچھ دیرچلنے کے بعد کار ایک باغ نما کمپاونڈ میں داخل ہوئی۔ کارسے اتر کر لانبے آدمی نے بائیں شانے کو ہلکی سی جنبش دی اور کہا ،’’میڈم سین ، آپ انھیں اندر بٹھایئے ۔ اورشیرپا ،تم انھیں اطلاع کردو ۔‘‘

شیرپا نے 'یس سر'کہااور لپکتاہوا سامنے والی عمارت میں داخل ہوگیا ۔میڈم سین مجھے ایک کمرے میں لے آئی ۔

کمرا خاصہ وسیع اورخوبصورت تھا۔ الماری ، میز ، کرسیاں ، کمپیوٹرساری چیزیں قرینے سے سجی ہوئی تھےں ۔ایک طرف کونے میں دیوار سے متصل ایک صوفہ سیٹ بھی تھا۔ میڈم سین نے مجھے صوفے پر بیٹھ جانے کوکہا۔

میں بلبل بہ دام تھرتھراتی ہوئی صوفے پردبک گئی ۔ کبھی خوفزدہ نگاہوں سے میڈم سین کامنہ تاکتی اور کبھی متجسسانہ نظروں سے کمرے کاکونا کونا چھانتی۔ میڈم سین ادھر ادھر کی باتیں کر کے مجھے بہلانے کی کوشش کرنے لگےں۔جب کافی وقت گزر گیا تو دھیرے دھیرے میری گھبراہٹ بھی کافورہوتی گئی ۔اور جبھی ایک سردار جی کمرے میں داخل ہوئے ۔ میڈم سین نے مسکراتے ہوئے انھیں وش کیا ۔وہ جواباً مسکراتے ہوئے ایک طرف بیٹھ گئے۔ پھر سفید دھوتی کرتاپہنے ایک ادھیڑ عمرشخص آیا ،جسے دیکھتے ہی میڈم سین دم سادھے ایک دم سے کھڑی ہوگئیں۔ اس کے بعد دو آدمی اور آئے ۔ میڈم سین نے انھیں بھی احتراماً'گڈ ایوننگ ' کہا ۔ میرا خوف جو کچھ دیر پہلے کافورگیاتھا ، پھر سے لوٹ آیا ۔ تھوڑی دیر بعد لانبا آدمی اور اس کے پیچھے شیرپا داخل ہوا ۔ میری دھڑکنیں تیزسے تیزتر ہوتی گئیں۔

لانبے آدمی نے ان چاروں سے باری باری ہینڈ شیک کیا اور آکر میرے روبرو بیٹھ گیا۔ دھیرے سے بایاں ہاتھ صوفے کے بازو پررکھااور دھوتی کرتا والے آدمی کی طرف دائیں ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا ، " مس نینا ، یہ ہیناس علاقے کے ایم ایل اے ،شری ہارو مجمدار۔" اس کے بعد اس نے باری باری تمام لوگوں کا تعارف کرایا ، "یہ ہیں سی بی آئی افسر کلدیپ سنگھ ، یہ ہیں ایس ڈی او ، شری سمیر ترویدی ؛وہ ہینچیف جوڈشیئل مجسٹریٹ ، شری سنیتی پاکھیرا۔ یہ لوگ

Anti Terrorist Advisory Committeeکے ممبر ہیں ۔ اور یہ ہےں انسپکٹر ٹھنڈوپ شیرپا ، یہ سب انسپکٹر جیاتی سین ۔" اور اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ،"اوریہ ناچیز احتشام حسن ، ڈی سی پی ، اسپیشل اسکواڈ ۔ "اورپھر ان سبھوں کو مخاطب کر کے کہا ،"اور جناب ، یہ ہیں ، مس نینا!!"

اس کے بعد انھوں نے میڈم سین سے اشارۃًکچھ کہا ۔میڈم سین میز تک گئیں ۔ انھوں نے دراز سے ایک پرچی نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا ، ''مس نینا ،کیایہ ہینڈرائٹنگ آپ کی ہے ؟"

میں نے پرچی پر نظریں گڑادیں ۔ہینڈ رائٹنگ تومیری ہی لگ رہی تھی ۔ شاید وہ خط تھا جو میں نے مرلی کو لکھاتھا ۔لیکن کب لکھاتھا کچھ یاد نہیں آرہاتھا ۔

میں ذہن جھٹکنے لگی ۔شعور لاشعورکا سمندر کھنگالنے لگی ۔

ویسے بھی میرے اور مرلی کے درمیان خط وکتابت کی نوبت کم ہی آتی تھی ۔ وہ خط لکھنے میں بخالت کرتاتھا ۔ اورکبھی کبھار لکھتابھی تھا تو دوتین سطروں سے آگے نہیں بڑھتا تھا ۔ جودوچارخط اس نے لکھے تھے ، سب کے سب مجھے زبانی یاد تھے ۔اس نے ایک خط میں لکھاتھا:

"نینا ،تم پہاڑ کی گود سے نکلنے والا شفاف جھرناہو ۔اٹھلاتی بل کھاتی ندی ہوتم ۔ ندی سے زمین سیراب ہوتی ہے اور تم سے میری زندگی " !

مرلی کا خط پڑھ کرمیں فوراً جواب لکھنے بیٹھ جاتی تھی ۔ اس روز بھی بیٹھ گئی تھی ۔ کہیں یہ وہی خط تو نہیں ؟

"مس نینا ،بتایئے یہ تحریر آپ کی ہے ؟'' حسن صاحب کی آواز سن کر میں تصور کی دنیاسے لوٹ آئی ۔کمرے میں موجود سبھی لوگ مجھے گھوررہے تھے ۔ میں

نے جھجکتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھادیا۔دیکھا ، ہانوہی خط ہے ۔ میں من ہی من پڑھنے لگی:

”ہاں میں ایک ندی ہوں۔لیکن ندی تو ساگر میں جاملتی ہے ۔ تم ساگر ہو۔میں تم میں مل کراپنا سب کچھ ارپت کردینا چاہتی ہوں“

”مس نینا ،آپ چپ کیوں ہیں ؟بتایئے یہ خط آپ نے لکھا ہے ؟'' حسن صاحب نے اپنا سوال دہرایا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔ اور پھر دھیرے سے پوچھ لیا ، ''لیکن وہ ہے کہاں ؟ ''

یہ پوچھتے ہی کمرے میں سنّاٹا چھاگیا۔جیسے ،سبھوں کو سانپ سونگھ گیاہو۔سب ایک دوسرے کو خالی خالی نگاہوں سے گھورنے لگے۔ میں باری باری سب کا چہرہ تکنے لگی۔ عجب سی گھٹن محسوس ہونے لگی۔ اور اس سے پہلے کہ میرادم گھٹ جاتا ترویدی صاحب نے خاموشی توڑی ،“اچھا ،مس نینا ، مرلی کے سمبندھ میں آپ کیا جانتی ہیں ؟ “

”آپ لوگوں نے تو یہ خط پڑھ ہی لیاہے ۔پھرمجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں ؟ “

اس بارسی بی آئی افسر ،کلدیپ سنگھ نے مونچھوں پرتاودیتے ہوئے کہا ،''مس نینا ،آپ جسے پیار کرتی تھی وہ کوئی ہیرووہیرو نہیں تھا۔ بزدل قاتل تھا وہ ۔ چھپ چھپ کے وار کرنااس کا پیشہ تھا۔ “

لفظ 'تھا' سن کر میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔میں رونی صورت بناکر چیخی ، ''تھامطلب!“

"وہ پولس مڈبھیڑ میں ماراگیاہے۔''مجسٹریٹ ،شری سنیتی پاکھیرانے نرمی سے جواب دیا۔

"پولس مڈبھیڑ میں!!'' میرا حلق سوکھنے لگا۔

"ہاں پولس مڈبھیڑ میں۔وہ غریب کسانوں پر اتیہ چار کیاکرتا تھا۔ ان کی کھڑی فصلیں تباہ کردیتاتھا۔ انھیں ان کے مولک ادھیکارسے ونچت کرکے ، ا ن پراپناپرابھاوڈالتا تھا۔ انھیں اپنے وش میں کرناچاہتا تھا ۔"

"نہیں نہیں ،وہ ایسا نہیں کرسکتا۔وہ توغریبوں کا ہمدرد تھا۔کسانوں ، مزدوروں کا دوست تھا"

''اتناسنناتھا کہ ایم ایل اے ،ہارو مجمدار کا چہرہ تمتمااٹھا۔ جھنجلاکر کہنے لگے ، ہونہہ ، وہ غریبوں کا ہمدرد تھا۔ کسانوں مزدوروں کا دوست تھا۔ اور ہم کیا ہیں؟ کسان مزدوروں کے دشمن؟ ہمیں غریبوں سے ہمدردی نہیں؟" اور پھر تھوڑے سے توقف کے بعد اپنے آپ پر قابو پاکر بولے ،" دیکھو ، بیٹی ، تم توجانتی ہو۔ آج Production اور Mode of Production کا Concept کتنا بدل چکاہے۔اب مزدور آگ کی بھٹی کے سامنے کھڑے ہوکر اپناخون پانی نہیں کرتے ۔ خطر ناک مشینوں پر کام کرکے جان نہیں گنواتے۔بلکہ ائیرکنڈیشن کمرے مینکمپیوٹرکے سامنے بیٹھ کر اتپادن کرتے ہیں۔جو لوگ محنت کے بدلتے ہوئے Concept ہی سے واقف نہیں وہ مزدور اورکسانوں کی بھلائی کیاکریں گے۔"

"مس نینا ، ایم ایل اے صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ نے اسے پہچانا نہیں۔" حسن صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ،"وہ ہماری طرح گوشت پوست کا انسان نہیں۔Terror تھاوہ۔ "

ایسے الفاظ استعمال کرنے کے باوجود حسن صاحب کے لہجے میں میرے لیے ہمدردی کاشائبہ صاف جھلک رہاتھا۔ایسا ہی شائبہ پرابی کی باتوں میں بھی جھلکتا ہے ۔ جب میں مرلی کے اندر بدلاوکاتذکرہ کرتی تووہ مجھے سمجھاتی ہے ،''دیکھ نینا ،ایسے لوگ ہماری طرح ہاڑ ماس کے انسان نہیں ہوتے۔ ایک ازم بن جاتے ہیں۔ تمام رشتوں سے بالاتر ۔ تمام بندشوں سے آزاد ۔"

میں پیشانی پر بل ڈالے اس کی باتیں سنتی رہتی ۔ اس کی آنکھوں کے سرخ ڈوروں کو تکتی رہتی ۔وہ کہتی جاتی ،'' نینا ،ایسے لوگ کسی کے ہاتھ نہیں آتے ،سایہ بن کر اندھیرے میں گم ہوجاتے ہیں۔ "

اور تب حسن صاحب نے مجھے سمجھایا ،''مس نینا ، چلئے اچھاہوا ، اس سائے سے آپ کا پیچھا چھوٹ گیا ،نہیں تو آپ بھی کسی بڑی مصیبت میں پڑ جاتیں ۔''

"صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں ،مس نینا !!'' کلدیپ سنگھ مسکراتے ہوئے بیچ میں ٹپک پڑے ،'' بائی دی وے ، اگر آپ چاہے تو ہم آپ کی سہیلی ، کیا نام ہے ؟ ہاں ، مس پرابی ، اسے اطلاع کردیں کہ آپ یہاں ہیں ؟ پولس چوکی میں۔ لوٹنے میں دیر ہوگی۔"

میں نے حیرت سے پوچھا ،''کیا!آپ پرابی کو جانتے ہیں" !!

سنگھ صاحب بڑا سا منہ بناکربولے ،''جاننا پڑتاہے ،بھئی ۔ آخر پولس والے جو ٹھہرے!!آپ کے ماں باپ ، بھائی بہن ، مکان ، گاوں ،ضلع ، تمام چیزوں کی تفصیل ہے ہمارے پاس "!!

حسن صاحب نے مداخلت کی ،''گھبرایئے نہیں ، ہم پرابی کو منع کردیں گے کہ وہ کسی سے کچھ نہ کہے ۔ آپ نے ہمارے ساتھ اتنا تعاون کیا ہے اگر "

"اگرکیا ؟"میں نے تعجب سے پوچھا۔''

”اگر اپنا موبائل دیں ،تو ۔یو ، نو روٹین انکوائری ‘‘حسن صاحب نے نرمی سے کہا ۔

اور پھر مجھ سے موبائل لے کرانھوں نے شیرپا کے حوالے کیااور کہا ، “ چیک کروا کے رپورٹ لاوفوراً ۔”پھر مجھ سے مخاطب ہوئے ،“دراصل معاملہ بڑا گمبھیر ہے ،مس نینا ۔ گزشتہ ہفتے پنچم تلہ کے پاس مسافروں سے بھری ایک بس کوبم سے اڑا ڈالا ۔ اٹھارہ لوگوں کی جانیں چلی گئیں ۔ چھ اسکولی بچے بھی تھے ۔ گیارہ لوگ اسپتال میں ہیں ، پانچ کی حالت تشویش ناک ہے ۔“

”لیکن آپ یہ مجھے کیوں سنارہے ہیں ۔ایسی خبریں توآئے دن اخبار ونمیں چھپتی رہتی ہیں ۔ سبھی پڑھتے ہیں ۔‘‘میں نے اُوب کر کہا ۔

”سنانے کی ضرورت ہے ، مس نینا ۔ حسن صاحب کے لہجے میں تھوڑی سی تلخی آگئی تھی ، “ کل رات انھوں نے گھمٹال گاوں میندھاوا بول دیا ۔ غریب گاوں والوں کو گاوں سے کھدیڑ کر ان کی زمینوں اور مکانوں پر قبضہ کرناچاہا ۔جب ہم وہاں پہنچے تو ہم پر گولی باری شروع کردی ۔ دونوں طرف سے گھنٹوں فائرنگ ہوتی رہی ۔ تین لوگ مارے گئے ۔ہمارا ایک سپاہی بھی شہید ہو گیا ۔کئی زخمی ہوگئے ۔میں بھی بال بال بچ گیا ۔ گولی پسلی چھوکر نکل گئی ۔ دیکھئے ! ‘‘ حسن صاحب نے بائیں طرف کی قمیض کادامن اٹھایا ۔ بازو سے پسلی تک پٹی بندھی ہوئی تھی ۔

اس کے بعد حسن صاحب نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا ، ‘‘آیئے ،مس کرن ، ہمارے ساتھ آیئے ۔“

کمرے میں موجود سبھی لوگ ان کے ساتھ کھڑے ہوگئے ۔ مجھے پیچھے والے کمرے میں لے گئے ۔میز پر دو لاشیں پڑی تھیں ۔پہلی لاش کے چہرے سے کپڑا سرکاتے ہو ئے حسن صاحب نے پوچھا ،“اسے پہچانتی ہیں ؟ “

میرادل بیٹھا جارہاتھا ۔میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے ،ہونٹ پر ہونٹ دباکر نفی میں سر ہلادیا ۔

اس کے بعد حسن صاحب نے دوسری لاش پر سے کپڑا ہٹایا ۔

میں تڑپ اٹھی ،دما غ سن سے ہوگیا ۔نظروں کے سامنے اندھیراچھاگیا ۔

اور جب ہوش آیاتو میں نے خود کو صوفے پرپڑاہواپایا ۔میڈم سین میراسر سہلا رہی تھیں ۔

حسن صاحب نرم لہجے میں بولے ،'' مس نینا ، آپ کاوہ خط اسی لاش کی جیب سے برآمد ہوا ہے ۔ '' انھوں نے چمڑے کاایک کا لا بٹوا میرے سامنے اچھا لا ، ''اس بٹوئے میں تھا ۔''

میں نے آنکھوں پر ہتھیلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا ، ''کیا آپ مجھے یہ بٹوا دے سکتے ہیں ؟''

''نہیں ۔ قانونی معاملہ ہے ۔'' حسن صاحب نے سر ہلاتے ہوئے کہا ۔

اس کے بعد حسن صاحب کاچہرہ میری نگاہوں میں دھندلاتا چلاگیا ۔

اورتب ایم ایل اے ہارو مجمدار کی آواز آئی ،''مس نینا ،آپ کس کی خاطر رورہی ہیں ؟ اس اپرادھی کی خاطر ؟ آپ کوتو خوش ہونا چاہیئے ۔ اس سے آپ کا پیچھا چھوٹا ۔''

میں پھوٹ پھوٹ کررونے لگی ۔ مجمدار صاحب نے کہا ،'' ٹھیک ہے ، رو لیجئے ۔ من ہلکاہوجائے گا ۔'' اور پھر حسن صاحب کو مخاطب کرکے کہا ،''رات زیادہ ہوگئی ہے ،ہم چلتے ہیں ۔ رپورٹ تیار کرکے بھیجوا دیجئے گا ،ہم دستخط کردیں گے ۔ ''

اور پھروہ سب حسن صاحب کو 'گڈ نائٹ' کہہ کر چلے گئے ۔

میں آنسو پونچھنے لگی ۔ حسن صاحب میرے سرپر ہاتھ پھیرکرمجھے تسلی دینے لگے ۔ انسپکٹر شیرپا کمرے میں داخل ہوئے ۔ حسن صاحب کو میرا موبائل تھما کران کے کان میں دھیرے سے کچھ کہا ۔

حسن صاحب نے مجھے موبائل لوٹاکر کہا ،'' مس نینا چلئے ، آپ کو ہوسٹل تک چھوڑدوں ۔"

۔پانچ ۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے ۔گرمی کی تپش کم ہوگئی تھی ۔ شہر کے شمال میں پہاڑی سلسلہ ہے ۔ اب وہاں سے فرحت بخش ہوائیں آنے لگی تھیں ۔ جب آسمان پرچاند پورے آب و تاب سے چمکتا ہے تو پہاڑی سلسلہ گہرے نیلے رنگ کی چادر میں لپٹ جاتا ہے ۔ اونچے گھنے پیڑوں کی جھنڈ سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی زمین پر روشنی کے خوشنما دھبّے پھیلا دیتی ہے ۔میں افسردہ حال ، چاند پرنظریں ٹکائے ،حسن صاحب کے پیچھے پیچھے چلنے لگی ۔چاندنی میں ڈوباہوا اس شہر کا منظر بڑا دلکش ہوتا ہے ۔لیکن اس کی دلکشی اب میرے لیے بے معنی ہوچکی تھی ۔

گاڑی سنسان سڑک پر تیزی سے بھاگ رہی ہے ۔ حسن صاحب اگلی سیٹ پر بیٹھے سگریٹ کاکش لے رہے ہیں ۔میں پچھلی سیٹ پر بیٹھی سسکیاں دابے سوچ رہی تھی ، "ہوسٹل میں سبھی جاگ رہے ہوں گے ۔ بستر پر اوندھے پڑے میرے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہوں گے ،''اچھاہوا مرلی ماراگیا ۔ دہشت گردوں کایہی انجام ہونا چاہئے ۔مرلی دہشت گرد تھا ۔ نینا دہشت گرد ہے ۔دہشت گردوں کے لیے ہمارے سماج میں کوئی جگہ نہیں ۔اسے ہوسٹل سے نکال دو ۔ یونیورسٹی سے نکال دو"

- چھ -

گاڑی ایک جھٹکے سے ہوسٹل کے پھاٹک پرآ رکی ۔ میں گاڑی سے اتری ۔ حسن صاحب کا شکریہ اداکیا ۔ ہاتھ ہلا کرانھیں الوداع کہا ۔ انھوں نے بھی مسکراتے ہوئے جواباً ہاتھ ہلا دیا ۔ اس کے بعد گاڑی اپنے پیچھے دھواں چھوڑتی ہوئی چلی گئی ۔

گاڑی کی آواز سن کر آس پاس کی کھڑکیاں کھل گئی تھیں ۔پرابی بال بکھیرے کان سے موبائل سٹائے پھاٹک کے پاس آ کرکھڑی ہوگئی تھی ۔ اسے دیکھتے ہی میری آنکھیں چھلک اٹھیں ۔ مینلپک کراس کے سینے سے لگ گئی ۔روتے ہوئے بولی ،"پرابی ، سب ختم ہوگیا!سب کچھ "!!

تھوڑی دیر میں پرابی سے لپٹی روتی رہی ۔ وہ بے حس وحرکت کھڑی رہی ۔اور تبھی اچانک میرا موبائل بج اٹھا ! اسکرین پر ایک اجنبی نمبر نمودارہورہاتھا ۔

میں نے فون کان سے لگایا ۔ایک جانی پہچانی آوازسن کر چونک پڑی ،''مس نینا ، وہ بس ہم نے نہیں اڑائی! نہ ہم نے غریب گاونوالوں کوکھدیڑا ہے ۔ ہم ایسے گھناونے کام نہیں کرتے !!"

میرے اوسان خطا ہوگئے ۔زبان سے بے ساختہ نکل پڑا ، ''توکیا پولس چوکی میں بھیکوئی نوکیلے دانت والا!!''

میں اب بھی پرابی سے لپٹی ہوئی تھی کہ اچانک مجھے اپنی گردن پر چبھن سی محسوس ہوئی!!

میں نے ہولے سے اس کو جھٹکا دیااور ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گئی !!

خوف و تحیر سے کانپنے لگی!!

پرابی سامنے کھڑی قہقہہ لگارہی تھی!!

آس پاس کی کھڑکیوں سے بھی بہت سارے نوکیلے دانت جھانک رہے تھے !!!

٭ ٭ ٭

(ترکش ،کولکاتا ،2011)

کہر آلود ندی

گلوبل وارمینگ دنیا والوں کے لیے ایک اہم مسئلہ بنا ہواہے۔ اس بارے میں ٹی وی پر آئے دن چرچے ہوتے رہتے ہیں۔ اس وقت بھی ہورہے تھے۔ چرچے میں شامل سبھی حضرات اس بات پر متفق تھے کہ اس آفت کی سب سے بڑی وجہ فضا میں کاربن ڈائی اکسائیڈ گیس کا اضافہ ہے۔ یہ گیس بھی عجب شے ہے جتنی تیزی سے حرارت جذب کرتا ہے اتنی تیزی سے حرارت خارج بھی کرتا ہے۔نتیجہ کے طور پر گرمی اور سردی دونوں ہی شدید رخ اختیار کر لیتی ہیں۔ لہٰذا اس بار بھی سردی شدید تھی۔

سین مہاشے رضائی اوڑھے پلنگ پر لیٹے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ رہ رہ کر زور زور سے پلکیں جھپکا رہے تھے۔ ناک بھوں بھی سکیڑ رہے تھے۔سکیڑ نے والی بات بھی تھی۔ چرچے میں شامل ایک حضرت گرمی سے گلیشیر پگھلنے سے متعلق بڑی پُر زور طریقے سے اپنی تشویش کا اظہار فرما رہے تھے۔ سین مہاشے نے براسا منہ بناکربدبداتے ہوئے کہا ،''ہونہہ ، یہاں رگوں میں خون کے جم جانے کی نوبت آگئی ہے ،اور یہ کہتے ہیں کہ گلیشیر پگھل رہا ہے ۔'' اتنا کہہ کر انھوں نے ٹی وی بند کردیا۔دو دنوں سے اس قدر سردی پڑ رہی تھی کہ کمزوروں اور ضعیفوں کا گھر سے باہر نکلنا ہی محال ہوگیا تھا۔

گھڑی نے تین کاگھنٹہ دیااورسین مہاشے نے گھڑی کی طرف نظریں پھیرتے ہوئے رضائی پیچھے کی جانب کھسکائی اور بستر پر کہنیاں ٹیکتے ہوئے دھیرے دھیرے اٹھ کر بیٹھنے لگے۔گھٹنوں کا درد بڑھ گیا تھا۔

انھوں نے گھٹنوں پر ہتھیلیاں رکھیں اور آہستہ آہستہ کئی بار چکریاں ہلائیں ۔ ہونٹ پر ہونٹ دبائے بڑی مشکل سے تین چار مرتبہ پاوں سمیٹے اور پھیلائے اور کہا ،''سین کچھ بھی ہو ،آج توتجھے جانا ہی پڑے گا ۔''

اورپھر وہ پلنگ سے اتر کر دیوار کے سہارے غسل خانے میں داخل ہوگئے ۔ ضروریات سے فارغ ہوکرجب نکلے تو گھٹنوں کی جکڑن قدرے کم ہوچکی تھی ۔

سین مہاشے گرمی کے دنوں میں سفید دھوتی کرتا پہنا کرتے ہیں اور سردی کے دنوں میں اندرایک تھرموکوٹ کی بنیان اور اوپر اونی نیم آستین ڈال لیتے ہیں ۔مگر آج موسم کا مزاج کچھ زیادہ ہی بگڑ ا ہوا تھا ۔ صبح ہی سے شمالی سردہواوں نے پورے علاقے کو اپنی زدمیں لے رکھاتھا ۔ لہٰذا انھوں نے دھوتی کرتا کے اندر احتیاطاً تھرموکوٹ کاپاجامہ بھی پہن لیا ۔ اوپر سے اونی نیم آستین ڈال لی ۔منکی کیپ سے اچھی طرح سر اور کان ڈھانک لیے ۔ کندھے پرکشمیری شال بھی تہ کر کے رکھ لی ۔ دستانے اور موزے پہن لیے ۔

باہر نکلنے سے پہلے انھوں نے شال کے ایک کونے سے عینک صاف کی اور آئینے کے روبرو کھڑے ہوکر ایک باربغور اپنی آنکھوں میں جھانکا ۔ دو چار سرخ ڈوروں کے سوا انھینکچھ اوردکھائی نہ دیا ۔بہو کو آواز دے کر دروازہ بند کرنے کو کہا اور چھڑی ٹیکتے ہوئے پارک کی طرف چل دیئے ۔

ریٹائرمنٹ کے بعد سے پارک میں جانا ان کا معمول بن گیا تھا ۔ بیوی جب تک زندہ تھیں تو ہوا خوری کے لیے صبح وشام دونوں ہی وقت پارک جایاکرتے تھے ۔ لیکن بیوی کے گزرجانے کے بعد صرف شام کے شام ہی جاتے ہیں ۔

آج وہ پونے چار بجے ہی پارک پہنچ گئے تھے ۔ قدرے پریشان لگ رہے تھے ۔ پھاٹک کے پاس بوڑھے برگدکے پیڑ کے نیچے آکھڑے ہوگئے ۔ پہلے سیمنٹ کی بنچ کی

طرف نظر دوڑائی ، پھرمڑ کر پھاٹک کے باہر دائیں بائیں دیکھا ،ایک لمبی سرد آہ بھری اورچھڑی زمین پر مارتے ہوئے من ہی من کہا ،"معلوم نہیں مشراجی کا کیا حال ہے ؟ مجھے تو امید کم لگتی ہے!"اس کے بعدوہ زور زورسے پلکینجھپکانے لگیں۔جیسے کوئی شے ان کی آنکھوں سے چپک گئی ہو۔

ادھرکئی برسوں سے سین مہاشے کودور کی چیزیں صاف دکھائی نہیں دیتیں ، عینک پہننے سے بھی نہیں۔سردی کے دنوں میں پپوٹے پھو ل جاتے ہیں۔پتلیوں پر ایک تیڑھی میڑھی نقرئی لکیر نمودار ہوتی ہے اور تھوڑی دیر بعددھند میں دھندلاکر اوجھل ہوجاتی ہے۔اور جب ایسا ہوتاہے تو سین مہاشے کے دل میں ہوک سی اٹھنے لگتی ہے ۔وہ پرارتھنا کرنے لگتے ہیں ، ''اے ، بھگوان یہ سردی جلدی سے گزاردے"!

اس بارجب فروری کا مہینہ ختم ہونے کو آیاتھااورسردی کازور گھٹنے لگاتھاتوانھوں نے راحت کی سانس لی تھی۔ لیکن پرسونرات تھوڑی سی بوندا باندی کیاہوئی کہ سردی الٹے پاوں لوٹ آئی ۔اور اس کے ساتھ سین مہاشے کی پتلیونپر نقرئی لکیرکے بننے اور دھندمیں دھندلا جانے کاعمل پھر سے شروع ہوگیا!

کل شام بھی سردی بہت تھی ، پھر بھی اکثر بوڑھے مقررہ وقت پرہی پارک میں جمع ہوگئے تھے۔ ویسے تو کلکتہ میں اب پارک کہاں رہا۔ گنتی کے جو دوچار بچے ہیں ان کے مقابلے شمالی کولکاتاکایہ پبلک پارک قدرے کشادہ اور شاداب ہے۔ باونڈری وال سے لگے ہوئے ڈابھ ، اشوک ،بکول ،پولاش ،آڑو ، برگد ،نیم ،ببول ، اورپیپل کے کئی گھنے درخت ہیں۔جگہ جگہ جوہی ،رادھاچوڑا ، کرشن چوڑا ،جباکسم جیسے پھولوں کی جھاڑیاں بھی ہیں۔ دو چار گلاب کے پودے بھی ہیں۔بیچ میں ایک جھیل ہے ،اور جھیل کے بیچوں بیچ چھوٹاسا ایک ٹیلہ۔ کنکریٹ کا ایک پل اس ٹیلے کو کنارے سے جوڑتاہے ۔جھیل کے چاروں طرف جگہ

جگہ بیٹھنے کے لیے سیمنٹ کی بنچیں بنی ہوئی ہیں۔ ٹہلنے والوں کے لیے کول تار کا ایک تنگ راستہ بھی بنادیاگیا ہے ،جس پر جوان سبک روی سے اوربوڑھے سست روی سے چل کر جھیل کاطواف کرتے ہیں۔ کل بھی حسب عِادت وہ چاروںبوڑھے جھیل کا طواف کررہے تھے کہ اچانک مشراجی کابایانانگ جھنجھنااٹھا۔ مگر انھوں نے پروا نہیں کی۔چلتے رہے۔تھوڑی دیر بعد چھاتی میں ہوک سی اٹھی اور پھر درد سے سینہ پھٹنے لگا۔ سانس چڑھنے لگی۔ آنکھوں کے آگے اندھیراچھاگیا۔ وہ خاصے فربہ تھے۔ ایسا فربہ اندام آدمی اگر زمین پر گرجاتاتوکوئی بڑا حادثہ ہوجاتا۔یہ تو اچھاہوا کہ بوس بابو ان کے پیچھے تھے۔ لپک کر انھیں تھام لیا۔نہایت مستعدی اور ہمت سے کام لیا ، کہا ، ’’آپ لوگ گھبرایئے مت۔میں ہوں نا! میں دیکھتا ہوں۔‘‘

اور پھرانھوں نے اپنی جیب سے بٹوا نکالا۔اس میں سے سوربٹریٹ کی ایک گولی نکال کر مشراجی کی زبان کے نیچے ڈال دی ۔ دوستوں نے سہارا دے کر مشرا جی کو پاس والی بنچ پر لٹادیا۔ بوس بابو چھاتی سہلانے لگے۔ تھوڑی دیر سہلاتے رہے ۔پھر رکشا بلا کر انھیں گھرپہنچانے لے گئے۔اس روز گھوش بابواورحنیف بھائی نہیں آئے تھے۔ مسٹرپال اور سین مہاشے بھی جانا چاہتے تھے لیکن بوس بابو بولے ،’’آپ کہاں خوامخواہ پریشان ہونے جائیں گے۔میں ہوں نا۔ ضرورت پڑنے پر آپ کو فون کردوں گا۔‘‘ اوربوس بابو کے اصرارکے آگے ان دونوں کو ہتھیار ڈال دینا پڑا۔

بوس بابو دراصل ضدی طبیعت کے آدمی تھے۔ اپنے آگے کسی کو پھٹکنے نہیں دیتے تھے۔ ہیلتھ اینڈ سوشل ویلفئر ڈپارٹمنٹ میںملازم تھے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعدبھی ان کے سر سے شوسل ویلفیئر کا بھوت نہیں اترا تھا بلکہ اور بھی سوار ہوگیا تھا۔صحت ابھی گری نہ تھی ، دوستوں کے مقابلے عمر بھی کم تھی۔ فعال بھی کم نہ تھے۔ ہر کام میں پل پڑتے تھے۔ چند ماہ پہلے کی بات ہے۔ گرمی کا موسم تھا۔بنچ پربوڑھوں کااڈا جماہواتھا ۔ جھیل میں کچھ نوعمرلڑکے تیراکی کے کرتب

دکھارہے تھے ۔ایک لڑکاتیر تا ہوا جھیل کے بیچوں بیچ گیااور ٹیلے پر چڑھ گیا۔ چلاکر چرچل کی طرح دوانگلیوں کی مدد سے ‘V’ کا نشان بناکر اچھلتا ہوااپنی فتح کا اعلان کررہاتھا کہ اچانک پاوں پھسلا اور وہ دھم سے زمین پر گر پڑا۔ عورتیں چلا اٹھیں۔ مرد چیخ پڑے۔ ‘بچاو بچاوکی آواز گونجنے لگی۔ اور تبھی بوس بابو تیرکی طرح چھوٹ پڑے۔ کنکریٹ پل سے گزر کر لڑکے کے پاس پہنچے اوراسے کندھے پر لاد کر کنارے لے آ ئے۔ لوگ تماشہ دیکھ رہے تھے مگر انھوں نے لڑکے کو بنچ پر بٹھا یا اس کے ہاتھ پاوں کی انگلیاں کھینچیں ۔اسے ہاتھ پاوں جھاڑنے کو کہا۔اور پھر ڈانٹ پلاتے ہوئے بولے ،’’ بیٹا ،اتنی ہیرو گیری دکھانے کی کیا ضرورت ؟ ‘‘

ابھی ان کا جملہ پورا نہینہوا تھا کہ لڑکا اٹھا ،کندھے سے سٹاکرگردن دائیں بائیں ہلائی اورمسکراتا ہوا ایسے چل دیاجیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو!

مسٹرپال نے بوس بابو کو مخاطب کر کے کہا ، ’’دِس ازنیو جنریشن ، یونو! بوس ،تم انھیننہینسدھارسکتے ۔الٹے یہ تمہیں سدھار دیں گے!‘‘

اتناسننا تھاکہ تمام بوڑھے بوس بابو کو دیکھ کر کھلکھلانے لگے۔

گھوش بابو نے کھانستے ہوئے کہا ،’’بوس ، بوڑھے ہو گئے ہو ، اس عمر میں اتنی دوڑ بھاگ اچھی نہیں۔‘‘

اس کے بعد مسٹرپال نے واکنگ اسٹیک کمر سے ہٹایا۔ اسٹیک سامنے رکھی اور اس سے پیشانی ٹیک کر مسکراتے ہوئے چٹکی لی ،’’ارے ،کہیں اس میں فیضو کی اسپریٹ تو نہیں انٹر کرگیا ہے ؟‘‘

’’فیضو کی آتما!‘‘گھوش بابو نے اِن ہیلر کی مدد سے سانس کی نلی میں دوا چھوڑی ، حیرت سے مسٹرپال کو دیکھا ،’’کون ، وہ سماج سدھار نیتا جو ؟ ‘‘

"ہاں ہاں وہی۔ ''اور اس کے ساتھ ہی مسٹرپال شروع ہوگئے ، ''ڈو یو نو ، اس نے ایک دن کیا کیا ؟"

گھوش بابو نے ان ہیلر جیب میں رکھتے ہوئے مداخلت کی ، "کیا کیا ہوگا ؟ جھولا لٹکائے کسی کو لے کر تمہارے گھر آدھمکا ہوگا۔ کہا ہوگا ،'اس کی بیٹی کی شادی ہے چاول ، گوشت یا پھر دلہے کے سوٹ کا بندوبست کر دیجئے۔ '

"او نو بوس ،ایساکچھ بھی نہیں ہوا۔'' مسٹر پال نے بمشکل ہنسی روکی اور کہا ،'' گھر میں اس کے سن کا سر پھوٹ گیا۔وائف ہوسپٹل لے جانے کوکہا تو وہ بولا کہ اسے ایک امرجنسی میٹنگ میں جانا ہے۔ جب اس کاوائف سن کو ہوسپٹل لے کرگیا تو دیکھا ، فیضو وہاں پہلے سے پریزنٹ ہے ۔وائف سوچا ،'آخراسے بچے کا پیار وہاں کھینچ ہی لایا!' لیکن دوسرے مومنٹ اس کا وائف فائر ہوگیا۔ بات ہی کچھ ایساتھا۔'' اتنا کہہ کر وہ کھلکھلانے لگے۔

گھوش بابوکی پیشانی پر اکتاہٹ کی نشانیاں ابھرنے لگی تھیں۔ ہانپتے ہوئے بولے ،

"او ، مسٹربراون امریکن پہلے منہ بندکر کے اچھی طرح کھلکھلا لے ، نہیں تو بتیسی باہر آجائے گی۔"

مسٹر پال کچھ دیر ہنستے رہے ،اور جب ہنسی کافوارہ قدرے کم ہوا تو گویاہوئے ، ''پتا چلا کہ فٹ بال کھیلتے وقت محلہ کے ایک لڑکے کے لیگ میں موچ آگیا تھا۔ فیضو اس کو ہی لے کر ہوسپٹل گیا تھا۔"

اتنا سننا تھا کہ تمام بوڑھے ہنس پڑے۔گھوش بابو نے بھی مسکرادیا۔ سین مہاشے کو مخاطب کرکے کہا ، ''دادا ،میرا کیا ؟نہ آگے نتھ ،نہ پیچھے پگھہ! بھگوان نے کوئی اولاد نہیں دی۔ ایک بیوی دی تھی سواسے بھی اٹھا لیا۔"

یہ سنتے ہی سین مہاشے کی ہنسی ایک دم سے غائب ہوگئی ۔ وہ گمبھیر ہوگئے ۔ موت کا ذکرسنتے ہی ادھر وہ اسی طرح گمبھیر ہوجاتے تھے ۔

-دو-

آ ج بھی وہ گمبھیر تھے ۔ اس قدر گمبھیر کہ جھیل کاچکر بھی نہیں لگایا ۔ وہ بڑی بےتابی سے بوس بابوکا انتظارکررہے تھے ۔ مشراجی کاحال جانناچاہتے تھے ۔ من ہی من بولے ، ''مشراجی بھی عجب لکیر کے فقیرہےں ۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور یہ ہےں کہ ایک موبائل تک نہیں رکھتے ۔ اور اس بوس کے بچے کو کیا ہوگیا ۔کمبخت کہہ کر گیا تھاکہ فون کروں گا ۔فون کرناتو درکناراس نے کل سے اپناموبائل ہی بند کر رکھا ہے !! اب لگتا ہے مجھے ہی مشراجی کے گھر جاناپڑے گا ۔ "

وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ گھوش بابو حنیف بھائی کا ہاتھ تھامے وارد ہوئے ۔ حنیف بھائی خاصا تندرست تھے ۔نوابوں کی مانند سینہ تانے سیر کو چلے آتے تھے ۔بے باک طبیعت کے مالک تھے ۔لیکن گزشتہ سال برین اسٹراک ہوااور جسم کا دایاں حصہ فالج زدہ ہو گیا ۔ چھ مہینے بستر ِعلالت پر پڑے رہے ۔جب تھوڑے چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تو کبھی کبھارپارک میں آجاتے تھے ۔ گھوش بابوان کے پڑوسی تھے ۔ وہی انھیں لے آتے تھے ۔ گھوش بابو نے حنیف بھائی کواحتیاط سے بنچ پر بٹھایا ۔ دایاں ہاتھ چھاتی پر اور بایاں ہاتھ منہ پر رکھ کر تین چار بار زور زور سے کھانسا ۔ جھک کر ایک کونے میں بلغم تھوکا اورہانپتے ہوئے کہا ،''سین دا ، کیا بتاوں ؟ میں نے فوج میں ساری عمر گزار دی ،لیکن یقین مانئے اتنی ٹائٹ سیکورٹی وہاں بھی نہیں تھی ۔ حنیف بھائی کی بیوی نے توپورا مارشل لا لگارکھا ہے ۔ "

سین مہاشے نے ہتھیلیوں سے گھٹنے دبائے ۔اورچہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھیرکر حنیف بھائی کی طرف دیکھا ۔

حنیف بھائی کچھ بولے نہیں۔ صرف اندر ہی اندر مسکراتے ہوئے مسوڑاچوسنے لگے۔

گھوش بابو نے جیب سے رومال نکال کراپنامنہ صاف کیا ،پھر اسی رومال سے بنچ پونچھی اور پھربیٹھ کر ڈرامائی اندازمیں کہا ،''پاجامے کا ازار بند باندھنے سے لے کرکرتا شیروانی پہنانے تک ،جوتاموزہ پہنانے سے لے کر تیل تھوپ کر کنگھی سے چندیا کھکھوڑنے تک۔ ہاتھ پکڑ کر دروازہ پرلانے اور میرے حوالے کرنے تک۔ ساودھانی ہی ساودھانی۔ اور پھر مجھے وارننگ!'' اس کے بعد گھوش بابونے ہاتھ اور چہرے کو جنبش دے کر نسوانی انداز میں کہا '' سنبھال کر لے جایئے گااور صحیح سلامت لوٹا جایئے گا ، کہہ دیتی ہوں ،ہاں۔ "

لیکن جب سین مہاشے نے گھوش بابوکی اس ظرافت آمیزی کا کوئی نوٹس نہیںلیا ، تو گھوش بابوکی پیشانی پرسلوٹیںپڑگئیں۔انھوں نے ایک لمبی سانس کھینچ کرپوچھا ، ''سین دا ، طبیعت تو ٹھیک ہے نا ،آپ کی ؟"

سین مہاشے کچھ دیر خاموش رہے ۔باری باری سبھوں کا چہرہ دیکھا ، پھربولے ، ''کل آپ نہیں آئے تھے۔کل مشراجی کوہارٹ اٹیک ہواتھا۔ ابھی تک ان کی کوئی خبر نہیں مل پائی ہے ؟بوس انھیں گھر چھوڑنے گیا تھا ، ابھی تک نہیں آیا۔ اپناموبائل بھی آف کررکھا ہے۔ "

یہ سنتے ہی حنیف بھائی کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔گھوش بابو کی بھی ہوائیاں اڑنے لگیں۔تھوڑی دیر تک تینوں خاموش بیٹھے رہے۔ یکایک ان تینوں کی نگاہ مسٹرپال پر پڑی۔

مسٹرپال کی عمر سترّسال سے کم نہیں۔سراور بھوں سفید ہوچکے تھے۔ لیکن چال میں ہنوز طمطراق ہے۔ہر وقت سوٹ بوٹ میں رہتے تھے۔پوس ماگھ کی سردی

ہویا جیٹھ بیساکھ کی گرمی کوٹ ٹائی اتارتے نہیں تھے ۔ہونٹوں کے درمیان کبھی بجھاہواور کبھی سلگتاہوا

چرٹ دبائے رکھتے تھے ۔انھیناپنے نام کے ساتھ بابو ،مہاشے ،دادایا بھائی لگوانا پسند نہیں ۔ اس لیے لوگ ان کے نام کے آگے مسٹرلگاتے تھے ۔ ہاتھ میں ہروقت واکنگ اسٹیک رہتی ہے ۔ آتے ہی زمین پراسٹیک دے مارتے تھے ۔ بنچ پرکم بیٹھتے تھے ۔ واکنگ اسٹیک پر کمر ٹیک کر امریکن اسٹائل میں انگریزی بولناشروع کردیتے ۔گردن کچھ تو انگریزیت کی بوجھ سے اورکچھ اسپانڈیلاٹیس کے درد سے اکڑی رہتی تھی ۔ادھر کئی دنوں سے نیک بیلٹ باندھ رہے تھے ۔ ویسے آدمی بڑے زندہ دل تھے ۔ لیکن آج وہ بھی بجھے بجھے سے نظر آرہے تھے ۔ نڈھال سر جھکائے چلے آ رہے تھے ۔ انھیں اس حال میں دیکھ کر سین مہاشے کا دل دھک سے ہوگیا۔ مسٹرپال قریب آئے گردن دائیں بائیں موڑی اور غمناک لہجے میں بولے ، ''فرینڈز بیڈ نیوز!!''

سین مہاشے کی زبان سے دفعتاًنکل پڑا ،''توکیامشراجی ہمیں چھوڑ کرچلے گئے ؟"

"نو ،ہی ایز اِن ہوسپیٹل ۔آئی سی یو میں ہے ۔ڈاکٹر نے فارٹی ایٹ آور کا ٹائم دیا ہے !مگر !!''

"مگر کیا ؟''گھوش بابونے فکر آمیز لہجے میں پوچھااور چھوٹی چھوٹی سانس کھینچنے لگے ۔

مسٹرپال منہ بسورے خاموش کھڑے رہے ۔گھوش بابو نے کہا ،''پال ،تیری پہیلی بوجھانے کی عادت ہروقت اچھی نہیں لگتی۔ جلدی بک جو بکنا چاہتاہے۔ "

اور تب مسٹر پال نے مٹی میں گڑے واکنگ اسٹیک کے سرے پر نظریں گڑاکر دھیرے سے کہا ، ''کل! کل ،بوس مرگیا ہیزنو مور"!!

سب کے سب انہیں منہ پھاڑے تکنے لگے ۔مسٹر پال نے تھوڑے توقف کے بعد کہا ،''مشراجی کورکشاسے اتاررہاتھا ،اکیلے ،اِلون ، گود میں اٹھا کر ۔اسی وقت مسیو اٹیک آیا ۔ اینڈہی ڈائیڈ اَن دی اسپارٹ ۔''

بوڑھوں کو سانپ سونگھ گیا ۔ ان کے دلوں میں ہوک اٹھنے لگی ۔سب سر بکف بیٹھے رہے ۔اور تب سین مہاشے کو محسوس ہواکہ ان کے پپوٹے پھولنے لگے ہیں ۔ پتلیوں پر تیڑھی میڑھی نقرئی لکیربننے اور دھندمیں دھندلانے کا عمل بھی شروع ہوگیا ۔

فضا میں پھیلی کہر کی چادر دبیزسے دبیز تر ہوتی چلی گئی ۔پیڑ پودے ،جھیل ، راستے ،چرند پرند سب دھیرے دھیرے اس میں ملفوف ہو کر غائب ہونے لگے ۔ سرد ہواونکا زور اور بھی بڑھتا گیا ۔

۔تین ۔

اور دوسرے ہی دن مشراجی بھی اس دیارِ فانی کوخیرباد کہے گئے !!

بوس بابو اورمشراجی کو مرے تین سال گزر چکے ہیں ۔اس درمیان بہت کچھ بدل گیاہے ۔ لیکن سین مہاشے کے پپوٹے ہنوز پھولتے ہےں ۔پتلیوں پر تیڑھی میڑھی نقرئی لکیرکے بننے اور دھندمیں دھندلاجانے کاعمل جاری رہتا ہے ۔اب بھی ان کے دل میں ہوک اٹھتی ہے ۔ گزشتہ سال کی سردلہریں حنیف بھائی اور مسٹرپال کو اپنے ساتھ بہا لے گئیں ۔ اس بار بھی فروری کے اخیر میں سردی لوٹ آئی تھی ، گھوش بابوکو اپنے ساتھ لے جانے کو ۔

اب سین مہاشے پارک میں ٹہلنے نہیں جاتے ۔ گھر میں قید رہتے ہیں ۔

مارچ مہینہ ختم ہونے کوآیاہے۔ گرمی خاصی پڑ رہی ہے ۔ پھر بھی سین مہاشے کے پپوٹے پھول رہے ہیں۔ بیٹے کی سخت تاکید ہے ، کھڑکیاں بند نہ کی جائےں! باباکو آکسیجن چاہیئے ! !

جہاں تک ہوسکتا ہے ،بہو ان کا خیال رکھتی ہے ۔کچھ دیر پہلے وہ آئی تھی ۔ دوا پلا کر ، مچھردانی لگا کرچلی گئی ۔

رات کاسنّاٹا بڑھنے لگا ۔ سین مہاشے کی پتلیوں پر نقرئی لکیر نمودار ہونے لگی ۔ مگر اس بار وہ لکیردھند میں دھندلائی نہیں ،اورنہ سین مہاشے کے دل میں کوئی ہوک اٹھی ۔اور پھر دھیرے دھیرے اس ٹیڑھی میڑھی لکیرنے ایک پُر پیچ ندی کی شکل اختیار کرلی ۔

باہر ہواکاجھونکا تیز ہوگیا ۔مچھردانی بادبان کی طرح پھیل گئی ۔ سین مہاشے کو محسوس ہوا ، وہ پلنگ پر نہیں ،کسی کشتی پر لیٹے ہوئے ہےں ! اور وہ کشتی اس پُر پیچ ندی میں بہتی چلی جارہی ہے !!

دور بہت دورکسی انجانی منزل کی طرف!!!

* * *

(سالنامہ آبشار ،کولکاتا ،2008ء دی سنڈے انڈین ، نئی دہلی ، 2009)

شہرِ اماں کی تلاش

اے یسوع ،کاندھے پر صلیب اٹھائے پہاڑی پر چڑھنے والے یسوع ،سنو! اگر میں تمہارے دور میں جیتا تومیں بھی تمہاری طرح ، بلکہ تم سے بھی زیادہ سہل طریقے سے اُس صلیب سے بھی زیادہ وزنی صلیب اٹھاکراُس پہاڑی پر چڑھ جاتا۔ہاں ، تم سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے ۔

تم معمولی آدمی نہ تھے۔پیغمبر تھے ،مسیحاتھے ،روح اللہ تھے ، اور کہتے ہیں کہ خدا کے بیٹے بھی تھے تم!تمہارے چھوتے ہی مریض شفاپاجاتے تھے ، مردے جی اٹھتے تھے ،نابینا دیکھنے لگتے تھے ،مجذوم صحت یاب ہوجاتے تھے ۔

اورہاں ،میں نے یہ بھی سناہے کہ جب تم نوزائیدہ بچے تھے ،تو اس وقت بھی تم نے ایک معجزہ کردکھایاتھا۔اپنی ماں کوبے آبرو ہونے سے بچایا تھا۔اس کی پاک دامنی کی دلیل دی تھی تم نے ۔پھر بھی جو حاسد تھے ،وہ ہٹ دھرمی پر اڑے رہے ۔ سو وہ آج بھی اڑے ہیں۔ مجھے ان کی ہٹ دھرمی پر حیرت نہیں ،البتہ اس بات پرتعجب ضرور ہے کہ وہ جو خود کو تمہارا پیرو کہتے ہیں ، تمہاری تقلید کا دم بھرتے ہیں ، اربوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود ان مٹھی بھر ہٹ دھرموں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ناچ رہے ہیں۔اے یسوع ،کیا تم نے بھی ان ناہنجاروں کے آگے خودسپردگی کر دی ہے ؟

یسوع ، مجھے دیکھو! میری اوقات ، میری بساط سب تم پر عیاں ہے ۔ ان ناہنجاروں کی گنتی اور طاقت بھی تم سے مخفی نہیں ۔ پھربھی یہ سب جھیل رہاہوں۔اپنی لاش سے کھیل رہا ہوں ۔ اے مسیحا ، کیا تمہیں ایسا لگتاہے کہ اگر میں تمہاری جگہ ہوتاتواتنی آسانی سے مصلوب ہوجاتا ؟ اس صلیب کے بوجھ سے دب جاتا ؟ مسیحا معاف کرنا۔ یہ پوچھے بغیرمجھے قرارنہیں کہ وہ صلیب جسے تم ڈھو رہے تھے کیاوہ تم سے زیادہ بھاری تھی ؟ وہ کیلیں جو تمہارے جسم پر ٹھونکی

گئی تھیں کیاسچ مچ وہ تمہیں اذیت دے رہی تھیں ؟ کیاان کی چبھن تمہارے لیے
ناقابلِ برداشت تھی ؟ اگر تھی بھی تو کیاوہ دائمی تھی ؟ مگر ان وقتی اذیتوں سے بھی
تم نے کیا خوب فائدہ اٹھایا ۔کیسا نام کمایاہے ۔ جوکام جیتے جی نہ کر سکے سولی پر
چڑھ کے کر دکھایا ۔اب تواکثر لوگ تمہیں ہی خدا مان بیٹھے ہےں ۔ خدا ئے عظیم
کوبھلا چکے ہیں ۔ میں ایک معمولی آدمی! میری اذیتوں کا کوئی ماتم دار نہیں ۔
آسمان پر اٹھنا میرا نصیب نہیں ۔ زمین کی گود میں سمانا میرامقدر کہاں ؟ پھرتا
رہوں گا در بدر وحشی آدم خوروں کانوالہ بننے کو!!

اوریسوع دیکھو ،ایک صلیب مجھ پر بھی لاد دی گئی ہے ۔اسے اٹھائے پھررہا
ہوں ۔ گر رہاہوں ،سنبھل رہاہوں ، لڑکھڑاتاہوا چل رہاہوں ۔ چلتاجارہاہوں ۔ شہرِ
اماں کی تلاش میں ۔بھٹک رہا ہوں دربدر ۔

پیدا ہوتے ہی یاپیدائش سے بہت پہلے ، پتانہیں کب ، میرے گلے میں یہ
صلیب ڈال دی گئی کہ جب سے ہوش سنبھالاہے ، اسے گلے سے چپکا ہوا پایا
ہے ۔کبھی کبھی توایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس صلیب کے ساتھ ہی مجھے اس
دنیامیں بھیجا گیاہے ۔ ماں نہیں رہی اور مجھ جیسے بدنصیبوں کی مائیں بھلا زیادہ
دنوں تک رہتی بھی کب ہےں ؟ اگر ہوتی تو پوچھتااس سے ، اس دائمی بوجھ کے
بارے میں ! کیاسچ مچ یہ دائمی ہے ؟کیا میں اسے یوں ہی زندگی بھر ڈھوتاپھروں گا ؟
اپنی ہی مٹی سے نکالاجاتارہوں گا ۔ کھیتوں کھلیانوں سے بے دخل ہو تارہوں گا ۔
پہاڑوں ، ندیوں ،جنگلوں ، صحراوں سے یوں ہی گزرتا رہونگا ؟

کوئی چارہ ساز نہیں ،کوئی غم گسار نہیں ۔ کوئی راستہ بتانے کوتیار
نہیں ۔سب گھات لگائے بیٹھے ہےں ۔ مجھ سے میری شناخت چھین لینے کو ۔یہ کون
ہیں ؟ چلے جا رہے ہیں جو منہ چھپائے ۔میں ایک ایک کا چہرہ تاک رہاہوں ۔ دیکھنا
چاہتاہوں مینان کی اصل صورت ۔پر انھوں نے اپنے چہروں پر قسم قسم کے مکھوٹے

چڑھا رکھے ہےں ۔ انسان جیسا کوئی نہیں لگتا !حالانکہ ان کی آنکھ ،ان کے کان ، ناک ،ہاتھ ، پاوں سب سلامت ہیں ، مگرصورتیں عجب ہیں !

اوریسوع سچ کہوں تو میں بھی آج تک اپنا چہرہ کہاں دیکھ پایا ہوں !پتانہیں میری صورت کیسی ہے ؟ میں بھی کیا انھی کی طرح نظرآتا ہوں ؟ مجھے لگتاہے ، میری کوئی شناخت نہیں ۔ میری مخصوص جسامت نہیں ۔

راستہ تپنے لگاہے ۔ کس نے آگ لگائی ہے ؟مجھے آگ کے اس دریا سے گزرنا ہوگا ۔ اس پار جانا ہوگا ۔ مجھے چلنا ہوگا ۔

میں چل رہاہوں ۔ چلتا جارہا ہوں ۔ جلتاجا رہا ہوں ۔ صلیب کابوجھ اٹھائے بڑھتا جارہاہوں !!اے یسوع دیکھو ،اب میں صحرا مینہوں ۔ دشت بے کراں سے گزر رہا ہوں ۔ اوراس وقت سب کی جو کیفیت ہوتی ہے میری ان سے چنداں بہتر نہیں ۔ ہونٹ خشک ہونے لگے ہیں ، پاوں میں چھالے پڑرہے ہیں ۔ صلیب کابوجھ بڑھنے لگا ہے ۔ حالت نا گفتہ بہ ہوگئی ہے ، پھر بھی چلتا جارہاہوں ۔

اور جب کبھی اس صحرائے لق و دق میں امید کی کوئی کرن دیکھتاہوں تو ٹھہرجاتا ہوں ۔

دور ایک سبزہ دکھ رہا ہے ۔اس سبزے پرمیری نگاہیں ٹکنے لگی ہےں ۔کھجور کے درخت اپنی شاخیں پھیلائے بلارہے ہیں ۔ مجھ کو کھجور کے درختوں سے الفت ہے ۔ میرے اسلاف کو بھی تھی ۔اور یسوع تمہیں بھی ہے کہ تمہاری پیدائش کے وقت تمہار ی ماں نے ایسے ہی ایک درخت کے سائے میں بیٹھ کر دم لیاتھا ۔اور بدلے میں دعائیں دی تھیں ، اسے شاداب رہنے کی ۔توپھر میں بھلا اس شاداب درخت کی دعوت پر لبیک کیوں نہ کہوں! کیوں نہ جاوں اس کے پاس ؟

اور دیکھو ، میرے قدم خود بخودکھجور کے ان درختوں کی جانب بڑھنے لگے ہیں! میں لبیک کہتا ہوا بڑھتا جارہا ہوں !! چلتا جارہا ہوں !!!

اوریسوع ، اب مینوہاں پہنچ چکاہوں۔ دیکھ رہاہوں ،بوسیدہ کپڑے میں ملبوس اس افسردہ عورت کوجو کنوئیں میں ڈول ڈال کر رسی تھامے بیٹھی ہے ۔ شاید تھک چکی ہے ، پودوں کو سینچتے سینچتے یا پھر میری راہ تکتے تکتے!!آنکھوں میں آنسو کی دھاریں خشک اورہونٹوں پر مسرت کی لہریں یخ بستہ ہوچکی ہیں ۔ زلفیں رخساروں سے الجھ رہی ہیں۔ سفید بھیڑ وں کا جھنڈ اس کے گرد طواف کر رہاہے ۔بے حرکت بیٹھی ہے وہ ، خاموش نظروں سے دیکھ رہی ہے مجھ کو۔میں بھی اسے دیکھ رہاہوں۔ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں! ! پر اس کی بے کل نگاہیں میری نگاہوں سے کہیں زیادہ تیز اور نوکیلی ہیں ۔ میری روح کی اتھاہ گہرائی میں اترتی جارہی ہیں۔میری تشنہ لبی بڑھنے لگی ہے ۔ ہاتھ خود ہی کشکول بنے اس کے سامنے پھیلتے جارہے ہیں ۔ یسوع ، مجھے لگ رہا ہے ، تمہاری ماں بھی ایسی ہی ہوگی۔ میری ماں بھی شاید ایسی ہی تھی ۔ مائیں تو ایک جیسی ہوتی ہیں ۔ایک دم اس دیوی جیسی!

اور دیوی نے میرادل پڑھ لیا۔ مسکراکرکہہ رہی ہے ،''ہاں میں تیری ماں ہوں ، تیری بہن ہوں ، تیری بیوی بھی ہوں میں اور بیٹی بھی!!"

اوراب وہ ڈول سے نکال کرپانی میرے کشکول میں ڈال رہی ہے ۔ ٹھنڈا ٹھنڈا ، صاف شفاف ،سنہرا پانی کہ اس کے پیتے ہی بے جان جسموں میں توانائی آجاتی ہے!!

اور یسوع ،جوں ہی میں نے کشکول منہ سے لگایا ، عین اسی قت ،ہاں ہاں ٹھیک اسی لمحہ ہرسو ایک شور برپاہونے لگا ۔قیامت کا سا شور! ایسا محسوس ہونے لگا ہے جیسے ایک ازدحام میری طرف بڑھتا آرہا ہے۔ میں جائے اماں تلاش

کررہاہوں ۔ادھر ادھر بھاگ رہا ہوں ۔ مگر تھک ہارکر چلاآرہاہوں اسی سایہ عاطفت میں ۔ پوچھ رہاہوں ، "تم جانتی ہو ، شہرِ اماں کا راستہ ؟"وہ بیٹھی سسک رہی ہے ۔میں حواس باختہ چیخ رہاہوں!! ازدحام ہاتھوں میں لہکتی مشعل تھامے بڑھتا آرہاہے !!ہیبت ناک قہقہے فضا میں گونج رہے ہیں!! اور اب پوراصحراجل رہاہے ۔آگ کی لپٹیں تیزی سے بڑھی آ رہی ہےں ۔ ایسالگتاہے کہ اب ذرہ ذرہ راکھ ہوجائے گا ۔ میں ڈر سے کانپ رہاہوں ۔ اور جب ڈر جاتاہوں تومیں خود پر قابو نہیں ر کھ پاتا ۔ مجھ پر میرا قابو نہیں رہا ۔ میں چیخ رہاہوں ،" یہ کیسا مذاق ہے ! کیا تمہیں نظر نہیں آتے میرے قدموں کے نیچے دھکتے انگارے ،میری پیٹھ پر لدی ہو ئی صلیب کا یہ بوجھ ؟ ''

مگر وہ مسکرانے لگی ہے ۔ اس کے بدن کی خوشبو میرے نتھنوں کو چھورہی ہے ۔اس کی آنکھوں سے محبت کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں ۔ میرے دل کے نہاں خانوں کو گرمارہی ہےں ۔ وہ مجھ سے کہہ رہی ہے ، ''یاد ہے پہاڑیوں سے گھراہوا وہ ریگزار ، جہاں پانی کاابدی چشمہ ابلاتھا ۔ اور وہ ٹیلہ جس پر بیٹھ کرتم آسمان چھواکرتے تھے ۔بڑاناز تھا ،تمہیں اپنی بلند پروازی پر ! کہوتھاکہ نہیں ؟"

میرا سر چکرانے لگاہے ۔میں جھنجلاکر پوچھ رہا ہوں ،''کون ہو تم ؟کیاتم نے وہ ابدی چشمہ دیکھاہے ؟اس کاپانی پیا ہے ؟اس ٹیلے کا طواف کیا ہے ؟ ''

اس کے لبوں پرعجب سی ایک مسکان ابھرآئی ہے ۔وہ کہہ رہی ہے ،''پہچانا نہیں ؟ میں نے ہی تمہارے پیروں میں بیڑیاں ڈال رکھی تھیں ۔ سونے کی بیڑیاں!! مگر وہ بیڑیاں کاٹ کر تم پُھر سے اڑ گئے ۔ آسمان میں گم ہوگئے ۔پر مجھے یقین تھا ۔اور جب یقین کامل ہوتاہے تو اس کے پورا ہونے میں کوئی تردد نہیں رہتا ۔میرایقین کامل تھا ۔تم ضرور آو گے ۔ تمہیں آناہی تھا ،سو تم آگئے ۔ مگر دیکھو اس مغرور نے پھراپنا سراٹھا یاہے ۔ پھر لاولشکرلایا ہے ۔ ہوشیار ، وہ آرہاہے !!"

”لیکن میں کیاکروں ؟ اسے روکنے کا کام تو ابابیلوں کاہے ؟‘‘

”نہیں اب ابابیلیں نہیں آئیں گی ۔ اب تمہیں ہی کرناہے وہ تمام کام۔“

”کیاکروں ؟میں تواس صلیب کے بوجھ سے دبا ہوا ہوں۔“

اور تب وہ پیکرِ حسن ایک تجویز بتاتی ہے ،''ایساکرو ،ایک سفید بھیڑ کا بچہ کاندھے پر اٹھالو۔میں کھجور کی ایک ٹہنی اٹھالیتی ہوں ۔ شاید وہ مان جائیں۔“

”مجھے نہیں لگتاکہ بھیڑکا بچہ مجھ سے اٹھ پائے گا۔میں تو پہلے ہی سے صلیب کے بوجھ سے دبا ہواہوں۔“

”تو ایک کام کرو ۔میرا ہاتھ تھام لواوراپنی منزل کی طرف دوڑ لگاووہ مستعد ہوئے کہتی ہے ۔

میں دیکھ رہاہوں۔آگ چنگھاڑتی ہوئی ہماری جانب بڑھتی آرہی ہے ۔ اب تو آسمان سے بھی آگ برسنے لگی ہے ۔ وہ ہاتھ تھامے مجھے کھینچ رہی ہے۔ ہم دونوں دوڑ رہے ہیں۔ دوڑے جارہے ہیں!!

یسوع ،پہلے میں اکیلا تھا اب بھارتی میرے ساتھ ہے۔ ہم دونوں بھاگ رہے ہیں۔ صبح وشام ،شب وروز بس بھاگتے جا رہے ہیں۔ چنگھاڑیں تعاقب کررہی ہیں۔اب یہ رفتہ رفتہ دھاڑ ینبنتی جارہی ہیں۔مگر یہ دھاڑیں شیر کی نہیں۔ تو کیا انھوں نے محض مکھوٹا پہن رکھاہے۔ہاں ہاں ، یہ مکھوٹاہی ہے۔ شیر بہادر ہوتا ہے ،یہ توعیار ہیں۔ شیر نہیں گیدڑ ہیں۔ بندروں کے لیڈر ہیں۔میں گیدڑ بندر بھپکیوں سے نہیں ڈرتا ۔ ان سے آنکھیں ملاتاہوا بھارتی کو سینے سے چمٹائے آگے بڑھ رہاہوں۔وہ پنجے مار رہے ہیں۔ ہمارا جسم لہو لہان ہو رہاہے۔ اگرچاہوں تو صلیب کودونوں ہاتھوں سے اٹھا کر ان کے سرپر دے ماروں ۔ان کامکھوٹا نوچ لوں ۔ لیکن میں نے توصبر کرنے کا تہیہ کر رکھاہے ۔میں صبر کر رہا ہوں! مینکرتارہوں گا۔ سنا

ہے 'وہ 'صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتاہے ۔'وہ' میرے ساتھ ہے ۔یہ تو ایک آزمائش ہے!! میں آزمائش کے مرحلوں سے گزر رہاہوں ۔ اور شاید گزرتارہوں گا ۔ پھر آتشی چیخیں نمودار ہورہی ہےں ۔ ساحل اور چوپاٹی جلا رہی ہےں ۔ خون اور گوشت دھواں بن کرہوامیں تحلیل ہورہے ہیں ۔ ہم نے رفتاربڑھا دی ہے ۔ اب ہم اوپر کی جانب بھاگ رہے ہیں ۔ بھاگتے جارہے ہیں ۔ سامنے ایک جٹا دھاری پہاڑ حائل ہوگیاہے ۔ زمین میں ترشول گاڑ ے سنگھ آسن میں بیٹھا رال ٹپکا رہاتھا ۔ ہمیں دیکھتے ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا ۔ ترشول میری چھاتی پر چبھوکر اپنی جٹا سہلا نے لگا ۔ اب وہ ہنس رہا ہے ، ''ہا ہاہا ہاہاہا!"

میری پیٹھ دکھنے لگتی ہے ۔صلیب پیٹھ سے اٹھاکرسینے پر رکھ لیتاہوں ۔ اس سے دست بستہ کہتاہوں ،''مہاراج !ہم شانتی استھل کے یاتری ہیں ۔ چھن بھر ہمیں شرن دیجئے ۔ اُس دُشٹ کی سینا اگنی شستر لیے ہمارے پیچھے پڑی ہے ۔ اور ہاں ، کرپّیا ہمارا پرنام گرہن کیجئے " !

وہ پھر قہقہہ لگارہاہے ۔آنکھوں کی پتلیاننچارہاہے ، داڑھی سہلا کر کہہ رہا ہے ، '' ہم تو اس کنیاکوگرہن کرے گا ۔اس سے سمبھوگ کر کے ہم اسے پوتر بناڈالے گا ۔"

پہاڑ کی بائیں طرف ندی ہے ۔اس میں امرت بہتاتھا ، اب دہکتا ہوا لاوا بہہ رہا ہے ۔میں بھارتی کا ہاتھ پکڑ آگ کے اس دریامیں کود پڑاہوں ۔ صلیب کو کشتی بنایا اور ہمت کو پتوار ۔کنارے سے آہ وفغاں ، نالہ و فریاد کا شوراٹھ رہاہے ۔ہم شورکی جانب بہتے جارہے ہیں ۔ہم اب شاید اس بوڑھے فقیر کے دیش میں ہیں جو عمر کی آخری گھڑی میں کہ جب اس کے اکثر ساتھی اپنا مستقبل سنوار رہے تھے ، بے غرض ،بے طمع آنکھوں پر گول عینک چڑھائے ،ناتواں ،بوسیدہ لباس لوگوں سے عاجزی کرتا پھررہا تھا ۔ حیف !صد حیف !! یہ شور اسی کے آشرم سے اٹھ رہا ہے ۔ اندر داخل ہوتے ہی سر چکرانے لگا ہے ،کلیجہ منہ کو آنے لگا ہے ۔ آشرم کو خطرناک تجربہ گاہ

میں تبدیل کر دیا گیاہے ۔ موت کے کھیل کا نیانیاطریقہ ایجاد کیا جارہا ہے ۔ قشقہ کھینچے ، گیرواوستر دھارے سوامی مہاراج چیلوں کے ساتھ تانڈوکررہے ہیں۔ حاملاو حاملاؤں کے پیٹ پر جھپٹ رہے ہیں۔نونہالوں کو تر شول کی نوک پر اچھال رہے ہیں۔ ضعیف ناتوانوں کو جلارہے ہیں ،نوجوانوں کے سر کاٹ رہے ہیں۔ بہو بیٹیوں کی شرم گاہوں پرایسے جھپٹ رہے ہےں جیسے گدھ مرداروں پرجھپٹا ہے ۔

لیکن ایک بچہ چھپتا چھپاتاچلا آیاہے۔ بھارتی کے پیروں سے لپٹ کر سسک رہا ہے۔ بھارتی اسے سینے میں چھپارہی ہے۔ اب سوامی مہاراج ہمیں گھور رہے ہیں۔ چیلوں کو آدیش دے رہے ہیں ’’آتنگ وادی! آتنگ وادی!! چیخ لگاوانکاونٹر کرڈالو ۔‘‘

سب ’آتنگ وادی!آتنگ وادی!!‘ چیخ رہے ہیں۔ ہم پر گولیاں برسا رہے ہیں ۔

اوریسوع دیکھو!ہم پھرسے بھاگنے لگے ہیں۔بھاگتے جارہے ہےں اور اب ہم حوروں کے دیش میں پہنچ گئے ہیں۔یہاننگوں کی بھیڑ ہے۔کیا واقعی یہ وہی زمین ہے جو بہشت کہلاتا تھا۔ ہاں ہاں ، یہ بہشت ہی ہے ،تبھی تو یہ لوگ مادرزاد گھوم رہے ہیں ۔ میں بھی اپنا ازار بند کھول رہاہوںکہ ان ننگوں میں شامل ہوجا وں۔ مگر بھارتی مجھے روک رہی ہے ۔ میں اسے سمجھا رہا ہوں ،’’یہ سچے لوگ ہیں۔ سچائی ننگی ہوتی ہے ۔ فطری حالت میں۔ یسوع سچے تھے ،تبھی تو ننگے ہی صلیب پرچڑھائے گئے تھے۔‘‘

بھارتی کہہ رہی ہے ،’’وہ مسیح تھے ،یہ مسیحانہیں!مسیحائی کا ڈھونگ رچا رہے ہیں!!‘‘

”اگر ایسا ہے تو آوہم انھیں قریب سے دیکھیں۔‘‘ میں یہ کہتا ہوں اور صلیب کا بوجھ پیٹھ پر ڈال کربچے کی کلائی تھام لیتاہوں۔اب ہم ان کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں ۔ لیکن ہمیں اب ایسا لگ رہاہے کہ ہم ایک دائرے میں قید ہوگئے ہیں۔ننگے لوگوں کے ہاتھوں میں پتا نہیں کہاں سے اتنے سارے طمنچے آگئے ہیں۔ کڑیل مونچھوں والاشخص شاید ان کا سردار ہے ،ہمیں ڈپٹ رہا ہے ،“تم دہشت گرد ہو! منشیات کے تاجر ہوتم!! جعلی نوٹوں کا دھندہ کرتے ہو !! ہم تمہارا شکار کریں گے۔ ہیڈ کوارٹر سے پیغام آیا ہے ۔ ہمیں دنیا کی سب سے بڑی طاقت سے ٹھیکہ مل گیاہے۔ ہمارے اس آپریشن کو دنیا کے تمام چینل کور کریں گی۔ ہماری جواں مردی کا چرچا گھرگھر گونجے گا ۔ اورہمارے آقابھی ہمارے منہ موتیوں سے بھر دےں گے ۔ ہاہاہا“

اور ایک ننگا ہانک لگاتا ہے ،’’جناب دیکھئے ، اس کا حلیہ !اس کی پیٹھ پرراکٹ لانچر!! یہ معمولی آتنک وادی نہیں ! !یہ اس گروہ کاممبر ہے جس نے اس فلک بوس عمارت کو“

سرداررکہہ رہاہے ،’’ہاں ہاں ،مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے ۔“

میں اسے یقین دلا رہاہوں ،’’نہیں ، ہم دہشت گرد نہیں ،منشیات کے تاجر نہیں ، نہ جعلی نوٹوں کا دھندہ کرتے ہیں ہم۔ہم تومسافر ہیں ،شہرِ اماں کے۔ منزل کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں ۔“

سردار بڑاسا سر ہلاکرکہہ رہاہے ،’’مجھے پتا ہے ،تم دہشت گرد نہیں۔ تم دہشتگرد ہو بھی نہیں سکتے ۔تم امن کے پیامبر کے پیرو کار ہو ۔ گوتم ،نانک اور گاندھی کے طرف دار ہو۔ لیکن میری بھی مجبوریاں ہےں۔ سمجھاکرویار“ !!

تیسراننگاسردار کے کان میں کچھ پھسپھسارہاہے۔ سردار کی آنکھیں چمکنے لگی ہیں ۔

اب وہ بھارتی کی چھاتی اور پیٹ کا باریک بینی سے جائزہ لے رہا ہے۔ کہہ رہا ہے ، ''ہمیں شک ہے کہ اس کے بدن میں غیر قانونی ہتھیارہے ۔ ہم اس کا باڈی سرچ کریں گے۔"

دوسراننگا بچے کوغور سے دیکھ رہاہے ۔بول رہا ہے ،''اورہمیں شک ہے کہ یہ لونڈا ہیومین بم ہے۔ہم اسے ڈیفوز کریں گے۔"

اب صلیب کا وزن بڑھ رہا ہے ،بڑھتا جارہاہے۔ میرے پیر زمین میں دھنستے جارہے ہیں ۔ وہ ان دونوں کو جھاڑیوں کے پیچھے لے جارہے ہیں ۔ جھاڑیاں ہلنے لگی ہیں۔ اب زور زور سے ہل رہی ہیں۔ آہیں ابھررہی ہیں!چیخیں پھیل رہی ہیں!! قہقہے گونج رہے ہیں!!! میں اپنی بے بسی کوکوس رہاہوں۔کانوں میں انگلیاں ٹھونس رہاہوں ۔ ٹکٹکی باندھے صلیب کو تک رہا ہوں۔ہزاروں کیلیں مجھ میں پیوست ہورہی ہیں ۔ میرا وجود چھلنی چھلنی ہورہاہے ۔

برہنہ جسم جھاڑیوں سے باہر نکل رہے ہیں۔بری طرح ہانپ رہے ہیں ۔سردار کہہ رہاہے ،'' اُف عورت کے جسم میں تو ڈھیرسارے ہتھیار تھے۔ غیر ملکی ہتھیار انگ انگ میںآرڈی ایکس بھرا تھا۔ ہم بھی کم تجربہ کار نہیں پرانے کھلاڑی ہیں ہم نے ان کا پرزہ پرزہ کھول کر معائنہ کیا ایک ایک حصہ کھرچ کھرچ کربرباد کردیا۔"

دوسرا ننگا اپنی فتح کا اعلان کررہاہے ،''اوراس سالے سنپولے کے پیٹ سے اتنابم برآمد ہوا ہے کہ اگرہم اس کا پیٹ چیر کر ڈیفوز نہ کرتے تووہ پوری دنیا کوتباہ کر

دیتا ہم نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے ہم تو آقاکے ہاتھوں سے نوازے جانے کے مستحق ہوگئے ہیں۔"

جھاڑیوں کے پیچھے سے ان کے کراہنے کی آوازیں آ رہی ہےں ۔میں اپنی پوری توانائی جھونک رہاہوں۔ اپنے پیر اکھاڑرہاہوں۔ بھاگتاہواجھاڑیوں کے پیچھے آگیا ہوں ۔ آنکھیں پھٹی جارہی ہیں۔ کلیجا منہ کوآرہاہے ۔دونوں خون میں لت پت پڑے ہوئے ہیں۔ بچے کا پیٹ سینے سے ذکر تک چاک ہے ۔ ہاتھ پاوں بکھرے پڑے ہیں ۔ ادھ کھلی نظروں سے وہ مجھے تاک رہا ہے۔ اپنے چاک شکم کی جانب آنکھوں سے اشارہ کررہا ہے۔ وہ ابدی نیند سونے والاہے۔اب وہ ابدی نیند سوگیاہے۔ بھارتی برہنہ پڑی ہے ۔ جسم پیلا پڑ گیا ہے ۔ چہرہ زرد ہوگیا ہے ۔ خون کاچشمہ ابل کر ران کے رستے بہتا ہوا زمین پرپھیل رہاہے ۔ پستان خون کے لوتھڑے بن چکے ہیں ۔ ایسالگ رہاہے کہ وحشیوں نے انگ انگ نوچ لیا ہے۔ ہلنے کی تاب نہیں اس میں۔ مجھے اداس نظروں سے تاک رہی ہے۔ ہکلاتے ہوئے کہہ رہی ہے ،"ان لوگوں نے میری التجا مان لی ہے وعدہ کیا ہے کہ تمہیں چھوڑ دیں گے مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکی۔مینتمہیں اس پرم آتما کے حوالے کرتی ہوں اسی پر میری آستھا ہے۔ "

بھارتی بہت کچھ کہنا چارہی ہے ،لیکن میری سماعت میرا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ اب ننگوں کا گروہ بھی جھاڑیوں کے پیچھے آگیاہے ۔ میں سردار کے روبرو کھڑا کر دیا گیاہوں۔ سردار کہہ رہاہے ،"ہم نے اس عورت کو زبان دی ہے ۔دیکھ ،اُس برفیلی چوٹی کو۔جا ، اُس پار چلا جا ،وہیں اس پار تیرا شہر ہے۔کیا کہا تھا تو نےہاں ، شہرِاماں !! جا ، ہم چھوڑ دیں گے ، آزاد کردینگے تجھے۔چلا جانا اپنے اُس شہرِاماں کو ۔"

صلیب پرمیری گرفت سخت ہونے لگی ۔میں مداخلت کرنے لگاکہ ایسی حالت میں مداخلت کرنا ہم پر واجب ہوجاتاہے ،''نہیں ، وہ میرا شہر نہیں۔ وہانمیرااماں نہیں ۔میرا شہر یہیں کہیں ہے ۔میرااماں میری مٹی میں ہے ۔"

"چپ ،بکواس کرتاہے ،سالا! سردار سے زبان لڑاتاہے!'' یہ کہتے ہوئے ایک سپاہی زور سے بندوق کا کندہ میری پیٹھ پر جڑرہاہے ۔میں تلملاکر زمین پرؔگررہاہوں ۔

سردار کہہ رہاہے ،''ہاں تو میں کہہ رہاتھا کہ کل ہم تجھے آزاد کردیں گے۔ تو دوڑ لگانا اپنے اماں کی طرف ۔اور ہاں ،یاد رہے ، تو جب تک دوڑتا رہے گا کوئی گولی نہیں چلے گی ۔یہ ہمارا وعدہ ہے۔ لیکن جہاں تو رکا'' وہ تھوڑی دیر خاموش رہتاہے۔ پھر دانت کھسوڑکر کہتا ہے ، ''آج کی رات تو ہمارا مہمان ہے ۔ہمارے ساتھ کھا ، پی! عیش کر!!"

رات گہری ہو گئی ہے ۔ میں نے آخری عشائیہ کھالیاہے ۔ صبح کو پہاڑ پر چڑھا یا جاوں گا ۔جانوروں کی طرح میرا شکارکیاجائے گا۔ پہلے ہاتھوں اور پیروں میں گولیاں داغی جائےں گی۔ پھر دھیرے دھیرے جسم کو چھلنی کیا جائے گا۔ فوارے چھوٹیں گے ۔ میرے پاس کوئی پیالہ نہیں ،کوئی یوسف نہیں ۔کون جمع کرے گا زخموں سے ٹپکنے والا خون!!

اورا ے یسوع دیکھو ،میں بھی شکار ہوگیا۔ "شہرِ اماں" تک نہ پہنچ سکا۔ میرے جسم میں سیکڑوں سوراخ بنادیے گئے ہیں ۔لہو کاآخری قطرہ بھی بہہ گیاہے ۔آسمان پر اٹھنا میرا نصیب نہیں ۔زمین کی گود میں سمانا میرامقدرکہاں ؟ سرِ راہ سڑتا رہوں گا۔ گلتا رہوں گا!!

اے یسوع ! مجھ پررحم کرنا ۔ایک کرم کرنا مجھ پر ۔میرا بوجھ اپنی پیٹھ پرلاد لینا ۔ پہنچادینا اسے میرے شہرِ اماں تک ۔ دفن کردینا وہاں اسے کسی محفوظ کونے میں ۔

خیال رہے ، یہ مقدس صلیب ہے! مسیحائی کی نشانی ہے !! اب کوئی اس کی اور بے حرمتی نہ کرے !!!

* * *

(مباحثہ ،پٹنہ ، جلد 2009 ،8)

لامکاں

سورج غروب ہو چکا تھا ۔مغربی افق پر سنہری کرنیں پھیل چکی تھیں ۔پرندے چہچہاتے ہوئے اپنے اپنے آشیانے کو لوٹ رہے تھے ۔ موسم کچھ زیادہ ہی خوشگوارتھا ۔ایسے خوشگوار موسم میں اکثر لوگ کھلی آنکھوں ہی سے سپنے دیکھتے ہیں ۔سو وہ بھی دیکھ رہی تھی ۔ خوش آئند مستقبل کے تانے بانے بن رہی تھی ۔ تیلیاں ایک دوسرے سے نبردآزما تھیں ۔ غالیچے پراون کا گولا ہمک رہاتھا ۔ ہونٹ ہل رہے تھے ۔ ان سے نکلنے والی ہلکی میٹھی آواز گیت بن کر مرتعش فضا کو تھپک رہی تھی ۔ جیسے ماں بچے کو لوری سنا رہی ہو ۔

اور تبھی وہ گھر میں داخل ہوا ۔ایک ہاتھ میں بڑے بڑے غبارے تھامے اور دوسرے میں جھولا!

ایڑیاں اٹھائے!! زمین میں پنجے گاڑے آگے بڑھتا گیا ۔ صوفے کی آڑ میں دبک کربیٹھ گیا ۔ ایک طرف چپکے سے جھولا رکھااورہولے سے اس کا پلّو کھینچ لیا ۔اور پھرڈور باندھ کریکسر چھوڑدیا ۔

غبارے اوپر اٹھتے چلے گئے اور ان کے ساتھ اس کا پلو بھی ۔

پھالگونی نے محسوس کیا کہ اس کاآنچل اچانک اوپر کی جانب کھنچتاجا رہا ہے ۔وہ بوکھلاگئی ۔ ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی ۔تیلیاں ہاتھ سے چھوٹ گئیں ۔ادھ بنا سویٹر زمین پر گر پڑا ۔اس کا پیٹ جو بہ ا عتبار حجم کسی طور ان غباروں سے کم نہ

تھا ،عریاں ہوگیا۔ کچھ دیر قبل فضا جوارتعاش داہے سکون کی سانس لے رہی تھی مرتعش ہوگئی ۔

پھالگونی نے جب نظر اٹھائیں اور چھت سے لگے ڈھیر سارے غبارے دیکھے تو سمجھ گئی۔ ایک سرد آہ بھر کے رہ گئی۔

وہ تالیاں پیٹتا ہوا صوفے کی آڑ سے نکلا۔ چہرے پر فخر و تغلب کے نقوش لیے ۔ جیسے کوئی قلعہ فتح کرلیاہو۔

اس نے یہ سب اپنے صاحب سے سیکھا تھا جو آئے دن میڈم سے اس طرح ٹھٹھولیاں کیا کرتے تھے۔ میڈم کو کسی حادثے کا احتمال نہیں ، لیکن پھالگونی تو امید سے تھی۔ایسی حالت میں اس کا روٹھ جا نا واجب تھا۔مگراس نے ایسا نہیں کیا ۔ بنسی دھر کے سینے سے چپک گئی۔اپنے نرم نازک رخسارسے اس کے شانے پر دباوبناتے ہوئے بولی ،''ایسی گھڑی ما(میں) کوئی ایسا مجاق (مذاق) کرت ہے ، بھلا! "

اور پھراس کی ہتھیلی تھام کر پیٹ پر پھیرتے ہوئے بولی ،''دیکھا ، کیسن سہم گئیل با۔ ابھی کھیلت رہا ، تھم گئیل با ۔ "

وہ پھالگونی کے پیٹ پر ہتھیلیاں پھیرنے لگا۔ بچے کی کلبلاہٹ محسوس کر نے کی کوشش کرنے لگا۔

جب کافی دیرہوچکی تو اس نے بنسی دھر کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا ،''ہٹا ،تم کا صاحب کے ہوا لگ گئیل با ۔ آج کل بے ہودے ہووت جات ہو۔ "

اور تب وہ الٹے پیر پیچھے کو گیا اور صوفے کی آڑ سے جھولا اٹھالایا۔ فرش پر انڈیل کر بولا ،''یہ رہا چکن ! کل صاحب اور میڈم کی چھٹی ہے ۔ بنانا ذرا کس کر کہ

وہ انگلی چاٹتے رہ جائیں ۔یہ مسالے ، آلو ، پیاز سب لے آیاہوں ۔ایک کام کر یہ سب سامان لے جا اور میرے لیے ایک کپ گرماگرم چائے لے آ ۔ “

پھالگونی نے سامان تھیلے میں بھرے ۔بائیں ہاتھ سے غالیچے پر پڑے سویٹر ، اون اور تیلیوں کو سمیٹے ، دائیں ہاتھ سے جھولا اٹھایا اوردھیرے دھیرے رسوئی کی جانب بڑھنے لگی ۔ بنسی دھرنے ٹی وی کاسوئچ آن کیااور ریموٹ لیے صوفے پربیٹھ گیا ۔

-دو -

شیبانی اپنی کیبن میں بیٹھی تھی ۔کئی دنوں سے اسی پروجیکٹ پر اٹکی ہوئی تھی ۔ اس نے کاغذ پر بکھرے ہوئے نقطوں کو پھر غورسے دیکھا ۔پھر اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں ۔ پپوٹے بھی پھڑ کنے لگے ۔ہونٹوں پر پپڑیاں جمنے لگیں ۔

نقطے پھر سے آپس میں جڑنے لگے تھے ۔ کاغذ پروہی معصوم چہرہ ابھرآیاتھا ۔وہ معصومیت کی دشمن نہیں ۔پراسے خوف ضرور تھا ۔ایک انجانا ،انچاہا خوف جو ایسے اوقات میں اکثراس کے اعصاب پر سوار ہوجاتاتھا ۔

اس نے ایک بار پھرہمت جٹائی ۔کاغذ سے نظریں کھینچ کرسامنے والی دیوار گھڑی پرجمادیں ۔کچھ دیرخاموش کھڑی ، گھڑی کی ٹک ٹک اور قلب کی دھک ھک کے درمیان ارتباط پیدا کرتی رہی ۔پھر جبڑے کس کرلرزاں ہاتھوں سے کاغذات فائل میں سمیٹے اور ریجنل منیجر کے کمرے کو لپکی ۔

آرایم کچھ دن پہلے ٹرانسفر ہو کراس شہر میں آیا تھا ۔شیبانی ابھی تک اس سے اچھی طرح واقف نہیں ہوسکی تھی ۔ گھبراہٹ کے عالم میں اجازت لینا بھول گئی ۔

لیکن بغیر اجازت اندر آنے پرآرایم ناراض نہیں ہوا۔ سنہری فریم والا چشمہ ناک پر چڑھاکر مسکرایا۔ اسے اشارتاً بیٹھنے کو کہا۔

و ہ نظریں نیچی کیے بیٹھ گئی ۔ کچھ دیر اسی طرح بیٹھی رہی ۔آرایم جہاں دیدہ آدمی تھا۔ سمجھ گیا ،بولا ،'' میں دیکھ رہا ہوں اس پروجیکٹ نے تمہینکچھ زیادہ ہی الجھا رکھا ہے۔ اسے چھوڑ دو ۔ دوسراپروجیکٹ ہے میرے پاس ۔ اس میں خود کو Involve کرو۔"

اس کے بعد آرایم نے میزپر سے ایک فائل اٹھائی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ، "Go ahead, Miss Sushant, Good Luck!"

شیبانی نے فائل تھام کر ، آرایم کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔

آرایم مسکرایا۔ سنہری فریم والا چشمہ ناک پر چڑھا تے ہوئے لہجہ بدل کر بولا ، "میرا مطلب ہے ، "Mrs Sushant !"

'مسیز' سوشانت بھی زیر لب مسکائی ۔ مچلتی ہوئی اپنی کیبن میں لوٹ آئی۔

جوں ہی اس نے فائل سے کاغذ نکال کر میز پر پھیلایا ، اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ سرورو انبساط کی رو جسم میں دوڑ گئیں۔

نقطہ عنقا تھا۔صرف لکیریں تھیں۔چھوٹی بڑی ،ٹیڑھی میڑھی ، نیچے سے اوپر دائیں بائیں اٹھتی ہوئی لکیریں ہی لکیریں۔

اسے محسوس ہوا کہ اس کا وجود جو کچھ دیر پہلے نقطوں میں سمٹ کر فنا ہورہا تھا لکیروں کے سہارے اچھلنے لگاہے۔

وہ نئے پروجیکٹ کومختلف زاویوں سے دیکھ رہی تھی ۔رہ رہ کر پنسل سے حاشیے پر نشان لگارہی تھی کہ دفعتًااس کاموبائل بج اٹھا ۔ کال نہیں تھا ، الارم تھا جو سوموار سے سنیچر تک شام کے ٹھیک چھ بجے بج اٹھتا تھا ۔

اس نے الارم آف کیا ۔ گھنے کالے گھنگرالے بالوں میں رنگین نوکدار انگلیاں پھیریں ، فائل الماری میں رکھ کر کنجی گھمائی ۔ شارٹ جمپر کوسامنے اور پیچھے سے دو ایک بارکھینچ کر لمبا کرنے کی کوشش کی اور کاندھے سے بیگ لٹکاکر دندناتے ہوئے باہر نکل آئی ۔

آج سنیچر تھا اورہر سنیچر کو گھر لوٹنے سے قبل وہ دونوں سیر سپاٹے کو نکل جاتے تھے ۔ نندن کیمپس ان کی من پسند جگہ تھی ۔بنگالی تہذیب کایہ مصنوعی گہوارہ مرد عورت ، بوڑھے جوان سبھوں کواپنی اور کھینچے رہتاہے ۔ شام کو یہاں نابغہ شہرکے اڈّے جمتے ہیں ۔

وہ دفتر سے نکلی تودیکھا سوشانت پہلے ہی پہنچ چکا ہے ۔ سوشانت نے کار کا دروازہ کھول دیا ۔ شیبانی خود کو کار کے اندر سمیٹتے ہوئے ڈانٹ پلانے والے انداز میں بولی ، ’’اتنی ٹرافک پھلانگ کر آنے کی کیا ضرورت تھی ۔ میں نے توکہہ دیاتھا ،پہنچ جاوں گی ۔“

سوشانت شوخ لہجے میں بولا ،’’ضرورت ہے جانِ من ،ضرورت ہے ۔“

اس نے بھی چٹکی لے کر کہا ،’’کیا بات ہے ، جناب کچھ زیادہ ہی رومانٹک لگ رہے ہیں ۔“

”کیوں نہیں ،لگوں !ہفتے میں ایک دن موقعہ ملتا ہے رومانس کا! اسے بھی گنوادوں!‘‘سوشانت کے لہجے میں ڈھٹائی کا عنصر تھا ۔

شیبانی چمکارتے ہوئے بولی''آہا رے ، باقی کے چھ دن تو جناب ہنومان چالیسہ پڑھتے ہیں!"

"ارے ،بیچ مینبیچارے ہنومان جی کوکیوں گھسیٹ رہی ہو !'' سوشانت نے ہتھیلیاں جوڑیں اورپرنام کے طور پر ماتھے سے ٹیک ڈرامائی انداز میں بولا ،''اس بالیکے کو کھما کرنا پون دیو!کھما کرنا!!"

''کیا بات ہے ہنومان جی سے اتنی شردھا!"

"شردھا تو ہے -تمہیں کوئی اپتتی ؟"

"مجھے کیا اپتتی ہوسکتی ہے ۔ چلو اچھا ہوا میری چھٹی!"

"چھٹی ،وہ کیوں!"

"اس لیے کہ اب تو جناب ہنومان جی کے بھکت بن گئے ہیں ۔''

"یہ میں نے کب کہاں ؟"

"ابھی ابھی تو کہہ رہے تھے ۔"

" نہیں نہیں -میں نے بھکتی کی بات نہیں کہی -میں نے تو شردھا کی بات کہی ہے ۔ '' اور پھر بات بدلتے ہوئے کہا ،''ویسے بھی اگرہنومان جی اس جگ میں پیدا ہوئے ہوتے اورانھیں تم جیسی مینکائیں مل جاتیں تو وہ بھی رومانس کرتے نہیں تھکتے"

''اچھایہیں بحث کرتے رہو گے یا گاڑی آگے بھی بڑھاوگے ۔ "

اورپھرگاڑی آگے بڑھی ۔انفارمیشن سنٹروالے گیٹ کے پاس آکر رک گئی ۔ شیبانی اتری ۔ کلا پریشد کو پھلانگتی ہوئی جھیل کنارے پہنچی اورچرچ کی طرف رخ کرکے

کھڑی ہوگئی ۔گھنیرے درخت کی پشت سے سنہری آسمان چھوتی ہوئیں ،جھیل کے گدلے پانی میں حسن کے خزانے ٹٹولتی ہوئیں ، دو میناریں ۔ شیبانی نے ایک گہری لمبی سانس کھینچی اور چھاتی کے اوپرکے تینوں بٹن کھول رومال سے ہوا کرنے لگی ۔لوہے کی ریلنگ سے کمر ٹیک کر پھیپھڑے خالی کیے اور تازہ دم ہوکر کالے گھنگرالے بالوں میں مخروطی انگلیاں پھیرنے لگی ۔

اب وہ خراماں خرامانششیر منچ کے پیچھے صحن میں چلی آئی جہاں تاڑ اور ناریل کے سرخ و سفید تنوں کے گرد دائرہ نماسیمنٹ کی نشستیں بنی ہوئی تھیں ۔آج یہیں اڈّے کی محفل سجی تھی ۔دھوتی کے کونچے کو گردن کے آگے پیچھے ملتے ہوئے ستواں ناک والے ایک بردّھا لجلجائے لہجے میں بھاشن دے رہے تھے ،'' ہماری سنسکریتی ، سبھیتا ،پرتھا ،پرمپرا سب داوپرلگے ہےں ۔ ہماری سنسکریتک مولّیں ٹوٹ رہی ہیں ۔ سماج پریورتیت ہورہاہے ۔تیور گتی سے بدل رہا ہے ۔ پچھمی شکتیاں بہو راشٹریہ کمپنیوں کے مادھیئم سے جال بچھا رہی ہیں ۔ بندھووں ، بڑی کٹھن پرستتھی ہے ۔ رہن سہن ، رشتے سنبدھ سب بدل رہے ہیں ۔ انھیں نئے ویدھی سے سمجھنا ہوگا ۔ انھیں پونہا پریبھاشت کرنے کی اوسکتااتپن ہوگئی ہے ۔ آج جدی گرودیو جیوت ہوتے تو"

شیبانی نے نندن ہال اور ربندر سدن کے سامنے لگی بھیڑ کا سرسری جائزہ لیا ۔ گھنے کالے بالوں میں نوکدارنگلیاں پھیرکر کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی ۔سوشانت اکیڈمی آف فائن آرٹس کی طرف کار پارک کرنے گیاتھا ۔ ابھی تک نہیں لوٹا تھا ۔ شیبانی پاس والی نشست پر بیٹھ گئی ۔ پہلا شخص اپنی باتیں ختم کر چکا تھا ۔ سفید پاجامہ کرتے میں ملبوس ایک ضعئف اپنی بات شروع کرنے جارہا تھا کہ سوشانت آدھمکا ۔ شیبانی کے گال پر ہلکی سی تھپکی لگاکر اشارے سے چلنے کو کہا ۔مگر وہ اٹھی نہیں ۔الٹے اسے ہی کھینچ کر بیٹھالیا ۔ ضعیف تقریر کر رہے تھے ،

’’یہ کارپوریٹ کلچراژدھے کی طرح ہماری تہذیب ،ہمارے سماج کو نگلتا جارہاہے ۔ ہماری روایت دم توڑ رہی ہے ۔آج اگر گرو دیو باحیات ہوتے تو “

اور جب سوشانت سے رہا نہ گیاتوشیبانی نے اس کاہاتھ پکڑا ۔ کھینچتا ہوا بنگلہ ا کاڈمی کے پاس لے آیا ۔فوڈ کورٹ کی طرف اشارہ کرکے بولا ،’’کیا کھاوگی ، بولو ، پیسٹری ، ہاٹ ڈاگ ، یا پزّا ؟ “

شیبانی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھااورکہا ،’’ میں تو لیمن ٹی پیووں گی ۔ “

سوشانت نے ایک چھوکرے کوہانک لگائی ،’’ کھوکھا ، میم صاحب کولیمن ٹی پلا ۔ “

’کھو کھا‘ٹین کاکنستر اور پیالیوں ،ڈبوں اور بوتلوں سے بھری بالٹی تھامے قریب آیا ۔ پلاسٹک کی پیالی میں ٹی بیگ رکھا ،ڈبیہ سے سیندھا نمک چھڑک کر ،دوچار قطرے پاتی لیموں کے نچوڑے اور المونیم کی کیتلی سے ابلتا ہوا پانی ڈال کر شیبانی کی طرف بڑھادیا ۔ سوشانت نے دو روپے کا ایک سکہ چھوکرے کی طرف اچھال کر اسے جانے کا اشارہ کیا ۔ شیبانی چسکیاں لینے لگی ۔

سوشانت موقع کی تاک میں تھا ، چہرے پر سنجیدگی اوڑھتے ہوئے بولا ،’’ڈارلنگ ، ایک مشکل آن پڑی ہے ۔گوہاٹی آفس کو لے کرپرابلم ہورہاہے ۔اروناچل ،میگھالیہ اور میزورم کا ٹارگیٹ لگاتار فال کررہاہے ۔اس لیے “

شیبانی چائے کی پیالی پھینک کرہنستے ہوئے بولی ،’’اب واقعی بھوک لگ گئی ہے ۔ چلو ’ہلدی رام ‘میں چلتے ہیں ۔ اور ویسے بھی آج تمہیں ٹریٹ دینا چاہئے ۔ “

’’ٹریٹ! وہ کیوں ؟“

شیبانی گھنے بالوں میں نوکدار انگلیاں پھیر کربولی ،''کیوں ؟تمہیں گوہاٹی آفس کی پرابلم سولبھ کرنے کا ٹھیکا جومل گیاہے ۔"

سوشانت تھوڑا ہچکچایا ۔پھرپیشانی پر پڑی سلوٹوں کومعدوم کرتے ہوئے بولا ، ''ہلدی رام کیوں ؟ 'میزبان 'میں چلتے ہیں ۔چانپ اوربریانی کھاتے ہیں ۔"

اورپھر دونوں اٹھے ،بانہوں میں بانہیں ڈالے ربندرسدن کے راستے نندن چوحدی سے باہر نکل آئے ۔کار میں بیٹھ گئے ۔اور تھوڑی ہی دیر میں کارریڈ روڈ پرہوا سے باتیں کرنے لگی ۔

-تین -

اس روز سوشانت اور شیبانی دیرسے گھر لوٹے تھے ۔جب وہ اپنے کمرے میں چلے گئے اور اندر سے چٹخنی لگا لی ، تو پھالگونی بستر پر لیٹتے ہوئے بولی ،''اب ان کا بھی ایک بچہ جروری ہے ۔"

"کن کا!!'' بنسی دھر نے بھوئیں جوڑ کر پوچھا ۔

"آر کن کا ،اپنی مایڈم کا ۔''پھالگونی نے اپنی موٹی ناک کے بڑے بڑے سوراخوں سے سردہواکاایک جھونکا خارج کرتے ہوئے کہا ۔

"ہاں ،تم ٹھیک کہتی ہو ۔بال بچے کے بغیر بھی کوئی زندگی ہوتی ہے!'' پھروہ پیشانی پر بل دےتاہوا پھالگونی کو کچھ دیر تاکتارہا ۔ اور پھر دھیمے سے بولا ،'' کہیں"

پھالگونی نے بھی پیشانی پر بل دیتے ہوئے پوچھا ،'' کہیں ! ،کا ؟"

"مایڈم بانجھ ''آواز اس کے حلق میں اٹک گئی ۔

”کیوں ؟ ساب ، نہیں ہوسکت ہیں کا ؟ ‘‘ پھالگونی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ۔

بنسی دھر نے ہونٹ بچکاکر موھڑے کو جنش دی ، ’’ہوبھی سکتے ہیں “

وہ کہنیوں کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گئی ۔بولی ،’’کل ہم ماں شُشٹی کے مندر جائب ۔ منت مانگب ۔ شُشٹی ماں مایڈم کی گودجروربھردیئیں ۔ “

اور دوسرے دن پھالگونی تڑکے دیوی ششٹی سے منت مانگ آئی ۔ اسے یقین تھا کہ ‘ماں ششٹی ’ اس کی منت ضرور پوری کرے گی ۔جب وہ گھرپہنچی تو اس وقت صاحب باتھ روم میں تھے اورمیڈم صوفے پربیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی ۔

وہ قریب گئی ۔ پیتل کی تھالی سے سیندورلے کر شیبانی کی مانگ اور پیشانی پر مل دیا ۔ جب شیبانی حیرت زدہ اسے گھورنے لگی تو اس نے ہنس کر کہا ،“دیکھا ، گورے مکھ پر سیندور کیسن کھلت ہے !”اور پھر تھالی سے پھول کی پنکھڑیاں اورپرساداٹھا کرشیبانی کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی ،’’ماں ششٹی کا پرساد! “

میڈم نے پرساد پر ایک نگاہ ڈالی ۔پھرآنکھیں پھاڑ کراسے دیکھا ۔

پھالگونی بولی ،’’ ماڈیم ، ماں کا نام لے کر کھائے لیجئے ۔ سب ٹھیک ہوجائب ۔“

میڈم نے بھوئیں جوڑ کر تعجب سے پوچھا ،“ کیا ٹھیک ہوجائے گا ؟ “

”ایک چاند سا منّا“

میڈم مٹھی میں پرساددبائے ہنستے ہوئے بولی ،’’ہاں ،ہاں چاند جیسا ہی ہوگا! بلکہ چاند سے بھی پیاراہوگا ۔ تیرامنّا!!“

”نہ ماڈیم ، اپنے لیے ناہی ،آپ کے منّے کا لیے منت مانگے ہےں ہم ۔ “

”میرے منّے کے لیے !“ میڈم نے مصنوعی قہقہہ لگایااورپوچھا ،”تجھے کس نے بتایا ،مجھے بچہ چاہئے ۔“

”کے بتائی ؟ ہم جانت ناہی کا ؟ عورت کی سب سے بڑی چاہت یہی ہوت ہے ۔“

”کیا چاہت ہوتی ہے عورت کی ؟“

”یہی کی وہ ماں بنے ۔ پھول سا بچہ اس کے گود میں کھیلے !“

میڈم نے پھالگونی کا ہاتھ تھام لیا ۔ اپنے اور کھینچا ۔پاس بٹھاکر تبسم ریز آنکھوں سے دیکھا ۔پھر پلکیں جھپکاکر گردن کو جنبش دیتے ہوئے بدبدائی ،”ارے پاگل ،ہم “

مگر اس سے آگے شیبانی کچھ نہ کہہ سکی ۔یا پھر وہ کہنا ہی نہیں چاہتی تھی ۔ ہونٹ دبائے بیٹھی رہی ۔پھالگونی کی آنکھوں میں تجسس کے اثرات ابھرنے لگے ۔ وہ اپنی مایڈم شیبانی کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی ۔

اورتب شیبانی نے پہلو بدلا ۔انگلیوں سے پیشانی دباکربولی ،”سر دکھ رہا ہے ۔ جا ایک کپ چائے بنالا ۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی پھالگونی کو اٹھنا پڑا ۔ رسوئی میں بنسی دھر دودھ گرم کررہا تھا ۔اس نے جب پھالگونی کا چہرہ اترا ہوا دیکھاتو تاڑ گیا ۔بولا ،”کیا بات ہے ری! اتنی گمبھیر کیوں ہوگئی ؟ “

پھالگونی نے گردن موڑ کر سرد مہری سے جواب دیا ،”کچھ ناہی ۔“

لیکن جب بنسی دھر نے اصرار کیا تو اس نے منہ بسور کر بنسی دھر کے کان میں پھسپھسایا ۔

بنسی دھر بھی گمبھیر ہوگیا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔لمحہ بھر دونوں غالیچے پر نظریں جھکائے کھڑے رہے۔ پھر دونوں نے کن انکھیوں سے ڈرائینگ روم کی طرف دیکھا۔ شیبانی صوفے پرپھیلی اخبار کے صفحات الٹ رہی تھی۔ سوشانت باتھ روم سے نکل آیاتھا۔ ہاتھ میں تولیہ تھامے منہ بنائے کہہ رہا تھا ،''ڈارلنگ ، بری خبر ہے ۔ میرا ٹرانسفر ہوگیا ہے۔"

شیبانی اخبار سے نگاہیں ہٹائے بغیر بولی ،''کہاں ، گوہاٹی ؟"

سوشانت چونک گیا ۔ آنکھیں پھیلا کر پوچھا ،''تمہیں کیسے پتا ؟"

"مجھے سب پتا ہے۔پروموشن مبارک ہو! اور ساتھ میں وہ بی ہوڈانسر ، 'مس بروا' بھی۔"

پھالگونی اوربنسی دھر ان دونوں کی آوازیں تو سن رہے تھے ، مگر ان کی باتیں پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھے۔ تاہم آنے والے خطرے کو شاید بھانپ چکے تھے۔ چنانچہ دونوں کے چہروں پررنج و غم کے آثا رابھرنے لگے تھے۔ پتھر کی مورت بنے انھیں تکتے رہے۔

-چار -

شیبانی آرایم کے کمرے میں پش بیک کرسی پربیٹھی کسمسا رہی تھی۔حسب عادت کالے گھنگرالے بالونمیں رنگین نوکدار انگلیاں پھیررہی تھی۔ کبھی پیٹھ پر سارا بوجھ ڈال کر جسم کو فرش کے متوازی کرلیتی ، کبھی پیٹ پشت اور گردن کو ڈنڈے کی طرح اکڑا کر سطحِ ارض پر عموداً ڈال دیتی۔ اب وہ میزپربچھے چکنے شفاف کانچ پر پیپر ویٹ نچا رہی تھی۔اس کے ذہن کے پردے پر بھی ایک چیز تیزی سے ناچ رہی تھی۔

لکیروں کا جال کبھی اوپر کی جانب پھیل جاتا اور وہ اس کے سہارے اوپر اٹھتی چلی جاتی ۔آسمان چھونے لگتی ۔مگر دوسرے ہی پل کڑکتے بادلوں کی اوٹ سے لال پیلی لکیروں کا دوسرا جال نمودار ہوتا جس کے چھوتے ہی وہ دھم سے زمین پرگرجاتی ۔ اٹھتی گرتی لکیروں کے اس جال میں اب وہ کچھ زیادہ ہی الجھتی جارہی تھی۔ مگر آرایم اس سے بے خبر اپنی ہی دھن میں مگن تھا۔ شہادتی انگلی سے سنہری فریم والے چشمے کو ناک پر چڑھارہاتھا۔ کان سے فون سٹائے بدبدارہاتھا۔

"اور ڈارلنگ تمہارے اُس نئے پروجیکٹ کا کیا ہوا ؟پاس ہوگیا ،گڈ! اور وہ ٹارگیٹ اکسیڈ کرگیا ، فنٹاسٹک اس بارمنیلا! ویل ٹرائی کرتے ہیں او کے دو تین دن کی بات ہے ، مینج کرلوں گا۔ لیکن اپریل میں نہیں مئی میں ،فلیپینس کی کسی کمپنی سے ڈیل فکسڈ کرنا ہوگا ۔ٹرائی کرتاہوں ہاں نیکسٹ منتھ میں کنفرم کردوں گا۔ ہاں ، مئی کے آخر میں ۔اور تمہارے نئے باس کا کیا حال ہے ؟ویری گڈ لگی رہو۔لگی رہو۔اوکے ڈارلنگ ، ٹیک کیئر ۔ببائی!!"

اور پھر میزپر موبائل رکھ کر اس نے شیبانی پرتبسم آمیز نظریں ڈالیں۔ شہادت کی انگلی سے ناک پر چشمہ چڑھاکر لڑکھڑاتے ہوئے بولا ،''یونو ،مائی بیٹر ہاف۔ ان۔ بینک کاک ویری ہاسپیٹبل ،ویری کواپریٹو لیڈی۔ پروجیکٹ منیجر تھائی کارپوریشن میں ویری ٹارگیٹ اورینٹڈپرسن!!"

شیبانی اندر ہی اندرجھلاّئی ،''وہ چڑیل ،تیری بیٹر ہاف ہے یاورس کوارٹر ، اس سے مجھے کیامطلب !اس کا پروجیکٹ پاس ہویافیل ، ٹارگیٹ اکسیڈ کرے یا اکزٹ اس سے مجھے کیاسروکار !کم بخت تویہ بتا کہ میرے پروجیکٹ کا کیا ہوا ؟اس کے لیے میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ اپنا سب کچھ داوپر لگاڈالا ہے "

آرایم کچھ دیر تک شیبانی کے چہرے کوبغور دیکھتارہا۔ پھر سنجیدگی سے بولا ، ''دیکھو ، ڈئیر! ہماری دنیا میں ٹارگیٹ سب کچھ ہوتا ہے۔ پاسٹ ،پریزینٹ کی کوئی اہمیت نہیں۔ فیوچر ہی سب کچھ ہے۔ ہم صرف ٹارگیٹ پر''

"سر ،میرا پروجیکٹ '' شیبانی نے ادا سے سرکو جھٹکادیا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ دابے خوبصورت نوکدار انگلیاں پیشانی پر رکھیں اور انھیناپنے گھنے گھنگرالے بالوں میں سمو کر پیچھے کی طرف مس کرتی چلی گئی۔

اس روز شیبانی دیرسے گھر لوٹی تھی۔ تھکی تھکی ، بوجھل بوجھل سی۔

سوشانت کھانے سے فارغ ہوچکا تھا۔صوفے پر بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

وہ لمحہ بھر رکی۔سوشانت پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور پھر گھنگرالے بالو ں میں انگلیاں پھیرتی ہوئی چپ چاپ اندر کمرے میں چلی گئی۔

اس رات سوشانت ڈرائینگ روم کے صوفے پر ہی پڑا پڑا سوگیا تھا۔

-پانچ -

پھالگونی رات سے کولہے کے نیچے درد محسوس ہورہا تھا۔اس کے باوجود وہ رسوئی میں گئی ۔برتن مانجھے ۔کپڑے دھوئے۔سبزیاں کاٹ کر چولہے پر رکھیں۔ چائے بنا کر صاحب اورماڈیم کو دے آئی۔بنسی دھر گھر بُہارکر بازار جاچکاتھا۔پھالگونی رسوئی میں تھی ۔ دیوار سے کولہا ٹیکے ناشتے کے لیے آٹا گوندھ رہی تھی کہ ڈرائنگ روم سے شور اٹھنے لگا۔صاحب اورمیڈم میں تو تو میں میں ہونے لگی تھی۔

”تمہیں کیاحق ہے میرے ذاتی معاملات میں ٹانگ اڑانے کا ؟میں تمہاری بیوی نہیں! تمہاری رکھیل بھی نہیں ! سمجھے!! تم اپنے معاملے مینجتنے آزاد ہو میں بھی اپنے معاملے میں اتنی ہی آزاد ہوں!!مائنڈ ایٹ ،مسٹر سوشانت!!“

”میں کب تم سے تمہاری آزادی چھین رہاہوں ،صرف ایک ہفتے کی بات ہے ۔ آئندہ جمعہ کو میری فلائٹ ہے ۔تب تک کے لیے رک جاو !!“

”ٹو ہیل وتھ یور فلائٹ !میں کل ہی چلی جاوں گی ۔تمہارے ایک ہفتے کے لیے میں اپنا فیوچر داوپر نہیں لگا سکتی ۔نیانیا پروجیکٹ ہے ۔ میں کوئی رسک نہیں لے سکتی ۔ “

”اوکے ،اوکے ،مس شیبانی ہالدار ،ڈِن ڈو واٹ یو لائک!“سو شانت نے جھنجلا کر کہا ۔

اس دوران میں بنسی دھر بازار سے آ چکا تھا ۔ اس نے بھی ان کی جھڑپ سن لی ، لیکن کچھ سمجھ نہینپایا ۔ دبے پاونرسوئی مینچلا آیا ۔ پھالگونی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر گھبراگیا ۔بات اس کی سمجھ میں اب بھی نہ آئی ۔ وہ پھالگونی سے پوچھنے والا تھا کہ صاحب کی آواز آئی ،“ بنسی دھر!“

پھالگونی کا دل دہل گیا ۔بنسی دھر بھاگتاہوا گیااور ان کے سامنے دست بستہ کھڑا ہوگیا ۔پھالگونی کام کاج چھوڑ انھیں دیکھنے لگی ۔

صاحب اور میڈیم بنسی دھر سے نگاہیں چرا رہے تھے ۔منہ لٹکائے صوفے پر خاموش بیٹھے تھے ۔ تھوڑی دیر بعد صاحب نے نظراٹھائی ۔میڈم کو دم بھر دیکھا ،پھر مرےل سی آواز میں کہا ،”بنسی دھر ،میرا ٹرانسفرہوگیا ہے ،گوہاٹی ۔مجھے کل ہی جاناہوگا!اور میڈم“

اور تبھی میڈم بیچ مینٹپک پڑی ،"ہم کل ہی یہ مکان چھوڑ دیں گے -تم لوگ اپنا بندوبست کرلو!!"

اتنا سننا تھا کہ بنسی دھر کے پاوں تلے سے جیسے زمین ہی کھسک گئی - وہ بھونچکّا انھیں گھور تا رہا -

اورجبھی پھالگونی رسوئی سے پھنکارتی ہوئی نکلی - جسمانی درد کا احساس جاتا رہا - بدحواسی میں سر پر پلّودینا بھول گئی -اسے پیٹھ ،پیٹ اور سینے کا بھی ہوش نہیں رہا -نیم عریاں حال تن تنا تی ہوئی پل پڑی - گرج کر بولی ، '' باہ کا بات ہے!! آپ لوگن اپن اپن ہک(حق)اور آجادی (آزادی) کاخوب ڈھنڈورا پیٹ رہت ہو - ہمار ہک اور آجادی کا کا ہوئی ؟ "

پھرنیم عریاں پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ،''ای ہمار بھاگ ہے - اس کا کوئی ہک (حق)اور آجادی(آزادی) ہے کی ناہی - ماڈیم ،ہم کہاں جائب ایسن حالت میں ؟''اس کے بعداس کی آنکھوں میں آنسووں کا سیلاب امنڈ پڑا - اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی -

تھوڑی دیر تک دونوں فرش پر نظریں گاڑے بیٹھے رہے -پھرایک دوسرے کو دیکھا ، سر ہلائے اور اٹھ کراندر کمرے میں چلے گئے -

بنسی دھر قفل بہ لب کھڑا رہا -پھالگونی آنکھوں پرپلو دبائے اب بھی رو رہی تھی -

سوشانت اور شیبانی جب باہر آئے توان کی مٹھیوں میں روپے کے چھوٹے چھوٹے پلندے تھے -صاحب صوفے پر براجمان ہو کر بولے ،'' گھبراو گھبراونہیں ! لویہ روپے رکھ لو !!''

میڈم پھالگونی کے پاس رک گئی ۔اس کے کندھے پر بانہیں پسار کر بولی ،''
پھالگونی ، ہماری مجبوری کو سمجھ ۔لے ،یہ روپے رکھ لے ۔ کام آئیں گے ۔ ''

''لیکن ماڈیم ،ہم جائب کہاں ؟''وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی ۔

میڈم نے کندھا تھپتھپاکر دلاسا دیا''پھالگونی ،اس دنیا کو تمہارے جیسے
ایماندار اورمحنتی لوگوں کی بہت ضرورت ہے!لے رکھ لے ۔''

''ماڈیم ، جن کے سر سے اچانک چھت''اس سے زیادہ کہنے کی وہ تاب نہ
لاسکی ۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔بنسی دھر اپنی بیوی کو سہارا دینے کے لیے لپکا ۔

پھالگونی کی نگاہوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا ۔ایسا محسوس ہونے لگا کہ
ایک دم سے کوئی بھاری بھونچال آگیا ہے ۔ دیوار ،چھت ، ستون سب اس پرڈھ گئے
ہیںاور وہ مکان کے ملبے میں دب کر دم توڑ رہی ہے ۔

۔چھ ۔

ای ایم بائی پاس پر کالی رنگ کی چمچماتی کار تیزی سے دوڑتی جا رہی تھی ۔
چیتھڑے میں لپٹی دبلی پتلی ایک کمزور عورت پچھلی سیٹ پرسمٹی بیٹھی تھی
۔'صاحب' خود ہی کار ڈرائیو کر رہے تھے ۔ ان کے پاس ایک بوسیدہ لباس آدمی بیٹھا
تھا ۔ رہ رہ کر وہ کن انکھیوں سے اس آدمی کو دیکھ رہے تھے ۔ آدمی نمناک نظروں
سے مڑمڑ کرپیچھے تاک رہاتھا ۔ رہ رہ کر پھٹے ہوئے گمچھے کے کونے سے بھیگی پلکیں
صاف کررہا تھا ۔ کار کے اندرسنّاٹا تھا ۔مگرکبھی کبھی عورت کی چھاتی سے 'چسر
چسر' کی آوازنکلتی اور سنّاٹے کا سینہ چاک کر جاتی ۔

'صاحب'اس آواز کی جانب متوجہ ہوجاتے ۔گردن موڑ کر پچھلی سیٹ کی
طرف دیکھتے ۔ پھرپاس بیٹھے آدمی سے کہتے ،'' رہنے کو گھر ملے گا ۔کھانا

پینا ،کپڑالتّا ،روپیہ پیسہ سب ملے گا ۔ مگر یاد رہے ، تمام کام کرنے ہوں گے ۔چولہاچوکا ،صفائی پوچھائی ،ہاٹ بازار ،گھر کی دیکھ بھال "

عورت پچھلی سیٹ پر پتھرائی بیٹھی تھی ۔سونی سونی نظروں سے دونوں کو تاک رہی تھی۔ آدمی کی پلکیں پھربھیگنے لگیں۔ پھر اس نے گمچھے کا کونا پلکوں پر دبالیا۔

گاڑی بائیں سڑک کو مڑی اورہلکے سے جھٹکے کے ساتھ رک گئی ۔سامنے ایک مکان تھا۔'صاحب' کار سے باہر نکلے ۔شہادت کی انگلی سے سنہری فریم کے چشمے کو ناک پر چڑھایااور دروازے کے پاس جاکر بیل بجایا۔

'کھٹ'سے دروازہ کھلا !

وہ دونوں کار میں دبکے بیٹھے تھے ، ٹھٹک کر رہ گئے !

کالے ریشمی گاون میں ملبوس 'میڈم' کھڑی مسکرارہی تھی ۔گھنے کالے گھنگرالے بالوں میں رنگین نوکدار انگلیاں پھیررہی تھی !!!

* * *

(آج کل ، نئی دہلی ،اکتوبر2010)

سفوکلس کا المیہ!

جب ناٹک کار کمرے میں داخل ہوااورانھیں اس حال میں دیکھا ، توآپے سے باہر ہوگیا! وہ جب بھی ان دو کرداروں کو ایک دوسرے کے بہت زیادہ قریب دیکھ لیتا تھا ، تو اسی طرح غصے سے بھر جاتاتھا۔

وہ دونوں بھی چونک کر ایک دوسرے سے الگ ہوجاتے۔ سر جھکائے کھڑے رہتے۔ ناٹک کار نوجوان کو ڈانٹ پلاتا ،''خبر دار پھر کبھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو! وہ حشر کر وں گا کہ خون کے آنسو روئے گا! پاگلوں کی طرح سر پیٹتا پھرے گا!! دفع ہو ، دور ہو یہاں سے!!''

نوجوان نظرجھکائے سرسراتاہواکمرے سے باہر چلاجاتا۔ اور تب ناٹک کار ابھنتری کو پھٹکار لگاتا ،''تجھے لاج نہیں آتی ۔کم سے کم اپنی عمر کا لحاظ کر!''کیا میں نے تجھے اسی دن کے لیے اداکاری سکھائی تھی ، تیرے فن کواسی لیے نکھار ا تھا کہ جب لوگ تجھے سرآنکھوں پر بٹھانے لگینتو تو ایک لونڈے کے عشق میں پاگل ہو کر میرے ارمانوں کا گلا گھونٹ دے۔

اس بار ناٹک کار کچھ زیادہ ہی بپھر گیا ۔ اس نے یہ چتاونی تک دے ڈالی ، ''مگر یہ نہ بھول ، ابھی تیرے فن کو تکمیل تک پہنچنا باقی ہے ۔ تیرے فن میں اب بھی خامی ہے!!اگر تواسی طرح جذبات کی رو میں بہتی گئی اور کوئی غلط قدم اٹھا لیا تو یاد رکھ ،بہت پچھتائے گی! شرم سے زمین میں گڑ جائے گی!!''

ابھنتری نے حیرت سے پوچھا ، "میرے فن میں خامی !! میں نے برسوں ریاضت کی ہے ۔ دن رات محنت کی ہے ۔ عورت کا کون سا ایسا کردار ہے ، جس پر میں نے اپنی فنکاری کی مہر نہ ثبت کی ہو ۔ اسٹیج پر اتر تی ہوں تو لوگ میری ہر ادا پرتالیاں پیٹتے ہیں ۔میری تعریف کرتے نہیں تھکتے! اور آپ!!'' اس نے پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے ناٹک کار کے چہرے کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور اپنی بات جاری رکھی ،''آپ کہہ رہے ہیں ، میرے فن میں اب بھی خامی ہے!!''

اور تب ناٹک کار نے سر ہلاتے ہوئے کہا"ہاں ، یہ سچ ہے کہ تو نے عورت کے سبھی کردار نبھائے ہیں ،اور بہت اچھی طرح نبھائے ہیں ۔ کئی کرداروں کو جاوداں بھی بنادیا ہے ، تو نے ۔ لیکن تجھے ایک کردارنبھانا باقی ہے ۔"

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد ناٹک کار پھر گویاہوا ،"ہاں ، باقی ہے ۔اوراب شاید وہ وقت آگیا ہے کہ میں اس کردار کی تخلیق کروں ۔ایک ایسا ناٹک لکھوں ، جو فن کی دنیا میں تجھے امر بنا دے گا ۔"

اوراس واقعہ کے بعد ناٹک کار اس کردار کی تخلیق میں جٹ گیا ۔ا پنے کام میں ایسا غرق ہوگیا کہ اسے خود کی خبر نہ رہی !! دن رات ، صبح شام سوچتارہا ، لکھتارہا ۔ جانچتا پرکھتارہا اور ۔ کئی مہینوں بعدجب ناٹک لکھ چکا تواس نے اس کے تمام کرداروں کو اکٹھا کیا ۔ کہا ،''اس کے بعد میں کوئی ناٹک لکھوں گا ، نہ کوئی رول نبھاوں گا ۔ ہدایت کاری بھی چھوڑ دوں گا ۔ یہ میری زندگی کاآخری ناٹک ہوگا ۔''

اور پھر اس نے ابھنتری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ،''تو ، اس کی ہیروئن ہوگی ، اوروہ نوجوان !!'' اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا ،" وہ نوجوان! کہاں ہے وہ نوجوان ؟"

ابھنتری نے کہا ،" میں نے اسے نہیں بلایاہے ۔"

''کیوں ؟''ناٹک کار نے پیشانی پر شکن ڈالتے ہوئے پوچھا ۔

ابھنتری پُرشوخ لہجے میں بولی ،" اسے دیکھ کر آپ ناراض ہوجاتے ہیں جو..."

"اسے دیکھ کر میں ناراض ہوجاتا ہوں ؟ ''ناٹک کارنے حیرت سے پوچھا ، ''یہ تجھ سے کس نے کہا ۔بھلامیں اس سے کیوں ناراض ہونے لگا ؟وہ تو میرے بیٹے جیسا ہے ۔ اسے فون کرو۔ فوراً آنے کو کہو!وہی اس ناٹک کا ہیرو ہوگا!!"

یہ سن کر ابھنتری کی جیسے باچھیں کھل گئیں ۔اس نے کئی دفعہ چاہا تھا کہ وہ ناٹک کار سے التجا کرے کہ نوجوان کو بھی اس ناٹک میں کوئی چھوٹا سا رول دے دے ۔ لیکن وہ یہ کہنے کی ہمت نہیں جٹاپائی تھی ۔اور اب جب کہ ناٹک کار نے خود ہی اسے ہیر و بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے تو اس کی خوشیوں کی انتہانہ رہی ۔ اس نے نوجوان کو فون لگایا ۔ فوراً آنے کو کہا۔ اور جب وہ آگیااورسبھی کردار اپنی اپنی جگہ پربیٹھ گئے ،تو ناٹک کار نے کہانی شروع کی:

ایک گاوں تھا ۔دور ،ندی کے پار!پہاڑوں ، جنگلوں سے گھرا ہو ، سرسبز گاوں! جہاں ہر دن سورج پائل کی چھم چھم اور سروں کی سرگم کے ساتھ طلوع ہوتاتھا۔ پائل جھنکانے اور نغمہ چھیڑنے والی شوخ چنچل حسیناوں میں سے ایک حسینہ وہ بھی تھی۔ اسے گاوں والے پیارسے مرگ نینی پکارتے تھے۔ مرگ نینی گاوں کی شان تھی ، جان تھی۔ شادی بیاہ کی تقریب ہو یا تیج تہوارکا موقع ، اس کے بغیرسب پھیکا پھیکا ، سونا سونا لگتا تھا ۔ایسے موقعوں پر وہ رقص اور گیتوں سے ایسا سماں باندھ

دیتی تھی کہ بچے اورجوان تو کیا پیرفرتوت کے بدن بھی تھرک اٹھتے تھے۔ لوگوں کی خوشیوں میں چار چاند لگ جاتے تھے۔ گاوں کے چھوٹے موٹے ناٹکوں میں وہ اپنی اداکاری کے خوب خوب جوہر دکھاتی تھی۔وہاں سردیوں کے موسم میں آس پاس کے قصبوں میں اکثر جاترا دل آیا کرتے تھے۔ان میں شہر کے نامور ڈراما آرٹسٹوں کے علاوہ بڑے بڑے فلمی ستارے بھی جلوہ گر ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ پاس والے قصبے میں ایک جاترا دل نے پڑاوڈال رکھا تھا ۔ مرگ نینی جاترا کی شوقین تھی۔ہر روز جاترا دیکھنے جاتی تھی۔ مہابھارت کی مشہور کہانی 'نل دمینتی' پر مبنی ناٹک کھیلاجارہا تھا۔ اسے اس ناٹک کے سارے مکالمے ازبرہوگئے تھے۔ ایک دن وہ ناٹک دیکھ رہی تھی۔کرداروں کے ساتھ ساتھ مکالمے دہرارہی تھی:

راجا نل: رانی ،دیکھو!دیوتاوں نے کس نسٹھرتا سے سبھوں کا وَدھ کردیا ہے۔

دمینتی: ہاں ،سبھوں کومارڈالاہے!(روتے ہوئے)تو پھر ہمیں کیوں چھوڑ دیا ؟

راجانل : وہ اس لیے تا کہ وہ ہمیں یہ جتلاسکیں کہ وہ کتنے بلوان ہیں!

دمینتی : ہم نے دیوتاوں کاکیا بگاڑا تھا ،جوانھوں نے اتنا کٹھورنرنئے لیا ۔ ہمارے ساتھ ایسا وَیوہار کیا ؟

راجانل : تم نے جوان کا پریم نویدن ٹھکرا دیاتھا۔اسی لیے وہ اتنے کرودھت ہوگئے!

اور اس کے بعد ہیروئن اپناڈائلاگ کہنے کو مڑی ہی تھی کہ اس کے پیر لڑکھڑا گئے اور وہ دھڑام سے فرش پرگرپڑی۔ اس کے پاونمیں موچ آگئی ۔ ہیرو مسلسل راجا نل کا ڈائلاگ دہرا رہا تھا۔اشاروں سے ہیروئن کوکھڑے ہونے اور اپنا کردار نبھانے پر آمادہ کر رہاتھا۔ لیکن ہیروئن درد سے کراہنے لگی تھی۔ درشکوں کو بھلا اس کے

کرہانے سے کیاسروکار ؟ وہ تو ناٹک دیکھنے آئے تھے ۔جب انھوں نے یہ ماجرادیکھاتو گالیوں کی بوچھار باندھ دی ۔ اسٹیج پرجوتے چپل پھینکنے لگے ۔ افراتفری کا ماحول بن گیا ۔ جاترا والے پریشان ہوگئے ۔وہ درشکوں سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے والے تھے کہ درشکوں کے بیچ سے رانی دمینتی کی آواز ابھری ،''وہ سب کے سب مجھ سے بیاہ رچاناچاہتے تھے ۔میں کسے چھوڑتی ،کسے چنتی!! میرے پریتم ، کہیں آپ مجھ سے بیاہ رچاکر پچھتاتو نہیں رہے ہیں!!''

درشک بھوچکّا رہ گئے ۔ شوروغل ایک دم تھم گیا ۔ کلاکار وں کو جیسے سانپ سونگھ گیا ۔ ہیرو حیرت زدہ ، بت بنا کھڑارہا ۔مرگ نینی نے اسے جھنجوڑا ، ''پریتم ، کہیں آپ پچھتا تو نہیں رہے ہیں!!''

ہیرو نے خود کو سنبھالادیااور پھر موقع کی نزاکت بھانپ کر اپنارول اداکرنے لگا ۔ اس نے مرگ نینی کی اشارتاًدل جوئی کی اور اسٹیج پر ڈٹے رہنے کو کہا ۔

راجانل : نہیں پریے ،کداپی نہیں! میں توتمہیں پاکرآنندمئے ہوگیاہوں ، پرنتو دمینتی ، یہ توبتاو ، تم نے مجھے ہی کیوں چنا ؟

مرگ نینی/دمینتی: اس لیے کہ آپ منش ہیں!اورمنش مجھے دیوتاوں سے زیادہ پریے ہیں!!

اورپھررانی دمینتی خوشی کے گیت گانے لگی ۔مورنی کی طرح ناچنے لگی ۔ راجانل کی بانہوں میں لہرانے لگی ۔گھڑی بھر کے لیے دیوتاوں کے ذریعہ ڈھائے گئے قہر کو بھی بھول گئی ۔

اور جب ناٹک ختم ہوا تو تالیوں کی گڑگڑاہٹ ،'واہ واہ 'کی صداوں اور سیٹیوں کے شور سے پورا شامیانہ گونج اٹھا ۔ جاترادَل کے سبھی لوگ مرگ نینی کا شکریہ اداکرنے لگے ۔

اوردوسرے دن علی الصباح مرگ نینی کمر سے گگری ٹکائے ،گاتی ،چھم چھم کرتی پنگھٹ کو چلی جارہی تھی کہ کسی نے آواز دی ، ''سنئے ! "

اس نے مڑ کر دیکھا ۔ جاترادَل کا ہیرو سامنے کھڑاتھا ۔وہ لہک کربول اٹھی ، ''ارے ، ہیرو جی ، آپ ؟ یہاں!!''

ہیرو نے کہا ،''آپ ہی سے ملنے آیاہوں ۔آپ توکمال کی اداکاری کرتی ہیں!! کل آپ نے ہمارے جاترادَل کی عزت رکھ لی ۔ ورنہ درشک اتنے اکھڑگئے تھے کہ شامیانہ ہی جلادیتے ۔ ہماراکتنا نقصان ہوجاتا ۔'' اور پھر ہنستے ہوئے بولا ،''اور مار پڑتی ،سو الگ!!"

مرگ نینی ادب سے بولی ،''بابو جی ،آپ مجھ سے بڑے ہیں ۔ بھگوان کے لیے مجھے 'آپ' نہ کہیں!!مجھے پاپ لگے گا ۔میرا نام مرگ نینی ہے!!"

"مرگ نینی!یعنی ہرنی جیسی آنکھوں والی ! واقعی ، تمہاری آنکھیں بہت خوبصورت ہیں ۔ تمہاری آواز ،تمہاری لے ،تمہارا رقص ، تمہاری اداکاری ، سب بے مثال ہیں ۔ اگر تم شہر میں ہوتی تو فلم والے تمہارے گھر کا چکر لگاتے نہینتھکتے ، تم بہت بڑی اسٹار ہو تی ۔"

مرگ نینی ہیرو کو بغور دیکھتی رہی ۔ نظروں کے تیراس کے دل میں پیوست کرتی رہی ۔ وہ بھی اس کا شکار بنتا رہا ۔ کچھ دیرتک دونوں کھڑے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے ۔ اورجبھی ٹھنڈی ہواکا ایک جھونکا اٹھا اور مرگ نینی کا آنچل اڑالے گیا ۔اس کا گندمی شباب پھٹ پڑنے کو بےتاب تھا ۔

اس کے بعدناٹک کار تھم گیا ۔ڈائری سے نگاہ ہٹائی ۔ چھوٹے بڑے سبھی کرداروں کے چہروں کا باری باری جائزہ لینے لگا ۔ سب کے سب دم سادھے بیٹھے تھے ۔

ابھنتری کی بے قراری اس کے چہرے سے عیاں ہورہی تھی ۔مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی ، ناٹک کار بول پڑا ، ''بتاو ، کیسی لگ رہی ہے میری یہ کہانی ؟"

سبھوں نے یک زبان ہوکر کہا ،''بہت اچھی ،بہت عمدہ!!"

اور تب ناٹک کارنے تنبیہ کی کہ بیچ میں کوئی کچھ نہ بولے اور نہ کچھ پوچھے ۔اگر کسی کے ذہن مینکوئی سوال ابھرے تووہ اس سے اکیلے میں پوچھ سکتا ہے ۔اور اس تنبیہ کے بعدناٹک کارنے کہانی کا سلسلہ آگے بڑھایا :

اورایک دن مرگ نینی ہیرو کے ساتھ بھاگ گئی ۔ جب وہ بھاگ رہی تھی تو بار بار اپنے گاوں کی اور مڑ مڑ کر دیکھتی اور سسکیاں بھررہی تھی ۔ہیرو دلاسہ دے رہا تھا ۔ اسے اس کے مستقبل کی خوش آئند جھلکیاں دکھارہاتھا ۔ اسے سمجھا رہا تھاکہ اس کی نگاہ مرگ نینی کی گدرائی ہوئی چھاتی پر جاٹکی ۔ چھاتی چڑھی ہوئی تھی ۔ ہیرو تجربہ کار تھا ، تاڑ گیا!!

وہ دونوں شہر چلے آئے ۔ مرگ نینی کی قربانی رفتہ رفتہ رنگ لانے لگی ۔اس کی ترقی میں اس کی محنت ، ریاضت اور فن کے تئیں اس کی رغبت شامل تھی ۔ہیرو بھی ہر موڑ پر اس کا بھرپور تعاون کرتا رہا ۔ اس کے فن کو نکھارتا رہا ۔ اسے کامیابی کے زینے چڑھنے میں مدد پہنچاتارہا ۔ بیس سال گزر گئے ۔اب مرگ نینی ایک منجھی ہوئی اداکارہ بن چکی تھی ۔ فلمی دنیا ہو یاناٹک منڈلی ہر جگہ اپنی شہرت کا پرچم لہرا چکی تھی ۔

اتناکہہ کر ناٹک کارپھرٹھہر گیا ۔سامنے میز پر سے گلاس اٹھایا ، اور غٹاغٹ کئی گھونٹ پانی پی کر گلاس واپس میز پر رکھ دیا ۔ایک بار پھر سب کے چہروں کا بغور جائزہ لینے لگا ۔

ابھنتری دانتوں میں ہونٹ دبائے اپنی مسکرا ہٹ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی ۔ نوجوان اس کامسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر مسرور ہورہاتھا ۔ آنکھوں اور ہونٹوں کے اشاروں سے پیغامِ عشق دے رہاتھا ۔ وہ بھی جواباً موقع بہ موقع نینوں کے بان مار رہی تھی ۔ ناٹک کاران دونونکی حرکتوں سے بے خبرنہ تھا ۔ وہ توبس ضبط کر رہا تھا ۔ کسی طرح اپنی کہانی مکمل کرنا چاہتا تھا ۔چنانچہ ان کی حرکتوں کو نظرانداز کر کے اس نے کہانی کا باقی حصہ سناناشروع کیا:

اور ایک دن ان کی جاترا پارٹی دور ، ندی کے پار ،پہاڑوں سے گھرے ایک قصبے میں خیمہ زن ہوئی ۔ اس دوران مینجاترا میں بہت ساری تبدیلیاں آچکی تھیں ۔ دیومالائی اثرات کم ہوگئے تھے ۔ہر طرح کے قصے پیش کئے جانے لگے تھے ۔ اس وقت جاترا پارٹی شکسپیئر کا ڈراما ، رومیو اینڈجولیٹ پیش کرنے آئی تھی ۔ ہیرو بوڑھا ہو چکاتھا ۔ اداکاری چھوڑکر ہدایت کاربن گیا تھا ۔ کبھی کبھار پروڈیوسروں کی درخواست پر کہانی اور اسکرپٹ بھی لکھ دیتا تھا ۔ اس لیے اب ہم اسے ہیرو نہیں ناٹک کار کہیں گے ۔ غرض یہ کہ ہیرو بدل چکا تھا ۔مگر ہیروئن مرگ نینی ہی تھی ۔ وہ جولیٹ کا رول ادا کرنے آئی تھی ۔ ایک ادھیڑ عمر اداکار رومیو کا کردار نبھارہاتھا ۔ ناٹک شباب پرتھا:

جولیٹ : رومیو! رومیو! تم نے رومیو بن کر کیونجنم لیا ؟ تم دشمنوں کے خاندان میں پیداکیونہوئے ؟ دیکھو ،ہماری محبت کے درمیان تمہارایہ نام آڑے آرہاہے ۔نامیں کیا رکھا ہے ؟ What's in name? تم اپنا نام بدل دو! گلاب کوچاہے جس نام سے پکارو ، گلاب ، گلاب ہی رہتاہے ۔ اس کی خوشبو نہیں بدلتی!!

رومیو: (پردے کے پیچھے سے)تمہاری باتیں سر آنکھوں پر ۔ تم مجھے جس نام سے پکارو ، آج سے وہی میرا نام ہوگا ۔ بس تم پیار سے ایک بارمجھے پکارلو ۔

میں دوڑا چلاآونگا۔ اب میں رومیو نہیں رہا۔ تمہارا پیار بن چکا ہوں ۔

جولیٹ : (حیرت سے)کون ، کون ہے وہاں جواس طرح چوری چھپے میرے دل کی باتیںنسن رہا ہے ؟ کون ہے ؟

اس کے بعد رومیو کو اسٹیج پر آجاناچاہیئے تھا ، مگر وہ نہیں آیا۔ مرگ نینی بارباراپنا ڈئلاگ دہرارہی تھی کہ شاید ہیرو اسٹیج پر چلاآئے ، مگر وہ آتا کیسے ؟ اس نے بے تحاشہ پی رکھی تھی۔ اتنی سکت باقی نہ تھی کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوسکے ۔گرین روم سے نکل کر اسٹیج پرآسکے ۔

درشکوں نے واویلا مچایا۔ اسٹیج پر اینٹ پتھر ، جوتے چپل کی برسات شروع ہوگئی۔ مرگ نینی گھبراگئی ۔ ناٹک کار نے چاہا کہ وہ خود ہی رومیو بن کر اسٹیج آ جائے ۔لیکن اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ بوڑھا ہوچکاہے۔ رومیو کے رول میں نہیں کھپ پائے گا۔وہ پس و پیش میں تھا کہ درشکوں کے درمیان سے ایک آواز ابھری ۔ بانکاسجیلاایک نوجوان مکالمہ کہتا ہوا اسٹیج کی جانب بڑھنے لگا ،"مجھے خود کی خبرنہیں! میں کون ہوں ، مجھے پتا نہیں!!اگر میرا نام رومیو ہے اور یہ نام تمہیں پسند نہیں ، تو نفرت ہے مجھے اس نام سے ۔ میں اس نام کو اپنے پیار کے بیچ کبھی حائل ہونے نہیں دوں گا ۔"

مرگ نینی حیرت میں پڑ گئی ۔اس کے ذہن کے پردے پر ایک پرانی تصویر ابھرنے لگی۔ لیکن اس نے ایکٹنگ نہیں روکی ۔ اپنا ڈائلاگ جاری رکھا:

مرگ نینی : (پر یشانی کااظہار کرتے ہوئے) رومیو!میرے رومیو!!تم نے اتنا خطرہ کیوں مول لیاہے ؟ اگر کسی نے یہاں دیکھ لیاتو تلوار سے تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کردے گا۔

رومیونوجوان :　جولیٹ ، تمہاری نظروں کے تیر تلواروں سے کہیں زیادہ تیزاور نوکیلے ہےں۔ جو تمہاری نظروں کے تیر سے گھائل ہوگیا ہو ،اسے تلواروں کی کیاپروا!!

جولیٹ　:　تمہیں یہانکس نے بلایا ؟

رومیونوجوان :　محبت نے !

اورجب ناٹک ختم ہوگیاتو سبھوں نے اس نوجوان کو بدھائی دی۔ جاترا والوں نے اس کا شکریہ اداکیا۔ مرگ نینی چھوٹے چھوٹے فنکاروں کو منہ نہیں لگاتی تھی۔ لیکن آج وہ اس نوجوان کے آگے جیسے خودسپردگی کر رہی تھی۔اسے اس کی اداکاری ،اس کا انداز ، اس کا بانکپن ، اس کی جوانمردی اوروضع قطع ایسی بھاگئی تھی کہ وہ اسے نینوں کے راستے اپنے من میں اتارتی چلی گئی۔

نوجوان بھی اس کی آنکھوں میں اپنامستقبل تلاش کرنے لگا۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے وہ دونوں رومیو جولیٹ کی جیتی جاگتی تصویربن گئے۔بانہوں میں بانہیں ڈالے باغ باغیچوں ، ہاٹ بازاروں ، کھیت کھلیانوں میں پھرنے لگے ۔

اور ایک دن جب دونوں نے حد سے تجاوز کرناچاہا۔لذتِ نفس کے اسیر ہوکر ایک دوسرے کے بہت زیادہ قریب آنے لگے ، توناٹک کار وِلین بن کر حائل ہوگیا۔ دونوں چونک کرالگ ہوگئے ۔سر جھکائے کھڑے رہے ۔ ناٹک کار نے نوجوان کو ڈانٹ پلائی ،“ خبردار جو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو!وہ حشر کر وں گاکہ خون کے آنسو روئے گا! پاگلوں کی طرح سر پیٹتا پھرے گا!!دفع ہو ، دور ہویہاں سے!!!جا دفع ہویہاں سے!!” نوجوان نظریں نیچی کیے سرسراتا ہوا چلاگیا۔اس کے بعداس نے مرگ نینی کو پھٹکار لگائی ، “تجھے لاج نہیں آتی ۔ کم سے کم اپنی عمر کا لحاظ کر !”

وہ اندر ہی اندر سلگنے لگی ،پر خاموش رہی!!

اور تب ابھنتری نے مداخلت کی ،''آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اس روز میں اندر ہی اندر سلگنے''

ناٹک کار نے منہ پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کو کہا۔ تنبیہ کی ،''میں نے منع کیا ہے نا! کوئی سوال نہیں کرے گا !! کسی کوکچھ پوچھنا ہو تومجھ سے اکیلے میں پوچھے !!'' ابھنتری 'ساری' کہہ کر خاموش ہوگئی ۔ اور ناٹک کار نے کہانی آگے بڑھائی :

اور جب جاتراپارٹی کلکتہ لوٹ آئی ،تو نوجوان بھی ساتھ چلا آیا۔مرگ نینی کے کہنے پر ناٹکوں اور ٹیلی ویژن سریلوں میں اسے چھوٹے چھوٹے رول ملنے لگے ۔ بطور ہیرو بڑے پردے پر آنے کی اب تک کوئی صورت پیدا نہیں ہوپائی تھی۔ لیکن مرگ نینی پردۂ سیمیں پر لانا چاہتی تھی ۔ اسے ہیرو بناناچاہتی تھی۔اور وہ جانتی تھی کہ اس کے لیے اس نوجوان کو کسی اچھے ناٹک میں ہیرو کا رول نبھانا پڑے گا۔ ایسا رول جس سے عوام کے دل و دماغ پر گہری چھاپ پڑے اور وہ اسے اپنا رول ماڈل بنالے۔اس کے لیے کسی بڑے پروڈیوسریا ڈائرکٹر کی سرپرستی لازمی تھی۔ اچھی کہانی ، اچھے گیت اور اچھی ہیروئن بھی درکار تھی۔ ویسے وہ خود ہی اس کے ساتھ بطورِ ہیروئن کام کرنے کو تیار تھی۔لہٰذا وہ ناٹک کار کو آمادہ کرناچاہتی تھی کہ وہ اسے اپنے کسی ناٹک میں موقع دے ۔ ویسے ناٹک کاربھی نوجوان کے فن کا معترف ہوچکا تھا ۔ اس نے کن انکھیوںسے نوجوان کو دیکھا ۔ نوجوان کے چہرے سے حیرت اور امنگ کے ملے جلے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ ناٹک کار زیرِ لب مسکریا اور کہانی کا سلسلہ آگے بڑھایا :

اور ایک دن پھر اس نے دونوں کو ایسے حال میں دیکھ لیاکہ اس کی آنکھیں شرم سے فرش پر گڑ گئیں!! اگر عین وقت پروہ وہاں نہ آتا تو انرتھ ہوجاتا۔وہ دونوں

لذتِ نفس کے اسیر ہو کر ایک دوسرے کے بہت زیادہ قریب آگئے تھے ۔ بانہوں میں جکڑ کر ،لب سے لب سٹائے ایک دوسرے کو بھینچ رہے تھے ۔ لباس کی بندشوں سے آزاد ہوکر صوفے پر دراز ہونے لگے تھے ۔اور جبھی ناٹک کار یمدوت کی طرح پرکٹ ہوگیا ۔چیخ کرکہنے لگا ، ''دھتکار ہے تم دونوں پر!!"

اس کے بعد ناٹک کار نے کہانی کا سلسلہ روک دیا ۔ چشمہ اتار کر میز پر رکھا اور ڈائری بند کر کے کہا ،'' بس یہیں تک!!"

تمام کردار تجسس میں پڑ گئے ۔یک زبان ہوکربولے ،''پھر کیا ہوا!!"

ناٹک کار نے کہا ،''میں نے پہلے ہی کہہ دیاہے ،کہ کوئی سوال نہیں کرے گا ۔ ا گر کسی کو کچھ پوچھنا ہو تو اکیلے میں ملے ۔"

سب خاموش ہوگئے ۔کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ ناٹک کار کی باتوں پر چونچرا کرے ۔ سب اٹھ کر چلے گئے ۔

اور دوسرے دن سے ریہرسل شروع ہوگیا ۔

مگر ابھنتری کوکہاں چین تھا ؟ اس کا تجسس بڑھتاگیا ۔نوجوان کی بھی حالت کچھ ایسی ہی تھی ۔ دونوں کہانی کا انجام جاننے کو بیتاب تھے ۔مگروہ جانتے تھے کہ ناٹک کار انہیں کچھ نہیں بتائے گا ۔ چنانچہ ایک دن دونوں چپکے سے ناٹک کارکے کمرے میں داخل ہوئے ، میز کے قریب گئے اور ڈائری کا پنّا الٹ پلٹ کر دیکھا ۔ دونوں دنگ رہ گئے!! باقی کا پنّا سفید تھا ۔دودھ کی طرح سفید!

اور ناٹک شروع ہوگیا ۔ناظرین کثیر تعداد میں امنڈ پڑے ۔ تمام اداکار اپنی اپنی اداکاری کے جوہر دکھانے لگے ۔اپنے اپنے کرداروں میں یوں سما گئے جیسے ان کی اپنی کوئی پہچان نہ ہو ۔ اپنا کوئی وجود نہ ہو ۔

ناٹک کا رنے واقعہ ،کردار ،مکالمہ ،تصادم اور آویزش کو رنگ ، روشنی ، آواز ، موسیقی ، پوشاک اور پس منظر سے اس طرح مربوط کردیا کہ ناظرین بھی خود کو اس ناٹک کا حصہ سمجھنے لگے ۔

اب ناٹک آخری مرحلے میں تھا۔ ناظرین پہلو دابے ، اسٹیج پر نظریں ٹکائے بیٹھے تھے۔ اسٹیج پر آنے سے پہلے ابھنتری نے ناٹک کار سے کہا ، "اب کلائمکس سین ہے۔ مجھے کیا کرنا ہوگا ، آپ نے تو ابھی تک بتایا ہی نہیں ۔" پیچھے کھڑے نوجوان نے بھی یہی سوال دہرایا۔

ناٹک کار نے ابھنتری سے کہا ،" میں نے یہ ناٹک تیرے فن کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے لکھاہے۔کیا اور کیسے کرنا ہے ،اس کا فیصلہ اب مجھے نہیں ،تجھے کرناہے۔وہ بھی بروقت ! برجستہ!! یہی تیرا امتحان ہے ۔اگر تواس امتحان مینکامیاب ہوگئی تو تیرا یہ کردار لافانی ہوجائے گا۔اور تو فن کی دنیا میں امر ہو جائے گی۔ "

اور پھر ناٹک کار نے نوجوان سے مخاطب ہوکرکہا ،''اور تیرے لیے بھی یہ ناٹک کم اہم نہیں ہے۔ یہ تیرے کیریر کی اڑان کے لیے ضروری ہے۔ '' اور پھر ان دونوں کو ایک ساتھ مخاطب کر کے بولا ، '' اب اس ناٹک کے کردار بھی تم ہو ، مکالمہ نگار بھی تم ، واقعہ نگار اور کشمکش کافوکس بھی تم ہو۔ کوئی بندش نہیں۔ کوئی پابندی نہیں۔ تمہارا مستقبل تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ جاو ، گھنٹی بج رہی ہے۔ درشک بے قرار ہیں ، تمہارے فن کا بہترین نمونہ دیکھنے کو!!"

اور پھر ناٹک کا آخری سین شروع ہوا:

جدیدطرز کے ہاوسنگ اپارٹمنٹ کے فلیٹ کا ایک ڈرائنگ روم۔بیچ میں صوفہ سیٹ۔ سامنے سنٹرل ٹیبل پر شراب کی بوتل اور گلاس ۔ پاس ہی میز پر قلم دان

میں پیتل کے دو موٹے موٹے نوکیلے چمکدار قلم رکھے ہیں۔ سامنے ڈائنگ ٹیبل پر پھل کی ٹوکری میں ایک لمبی چمکیلی چھری سیدھی کھڑی ہے ۔

مرگ نینی ایک ہاتھ میں شراب کاگلاس اور دوسرے میں سلگتاہوا سگریٹ تھامے صوفے پر بیٹھی ٹیوی پر شہوت انگیز منظر دیکھ رہی ہے ۔ حصولِ لذت کو دوبالا کرنے کے شوق مینره ره کر سگریٹ کا کش لے رہی ہے۔ اور شراب کے گھونٹ حلق میناتارتی جارہی ہے۔

نوجوان کمرے میں داخل ہوا ۔ اسے دیکھتے ہی اس کاچہرہ چمک اٹھا ۔اس نے خمار آلود نگاہوں سے نوجوان کو پاس آنے کا اشارہ کیا ۔ نوجوان کی سانسیں پھولنے لگیں۔

نوجوان : (کن انکھیوں سے ٹی وی پر شہوانی منظر دیکھتے ہوئے) تم نے مجھے بلایا ؟ کیا کوئی پروڈیوسر راضی ہوگیاہے ، مجھے ہیر و بنانے کے لیے ؟

مرگ نینی : ہوں گے !سب راضی ہوجائیں گے!! تم من چھوٹاکیوں کرتے ہو ؟ جب تم میرے دل کے ہیرو بن گئے ہو ، تو بہت جلد دنیا والے بھی تمہیں ہیروتسلیم کرلیں گے ۔(شراب کا ایک گھونٹ لے کر)دیکھنا ، ایک دن تم سپر اسٹاربن جاوگے!ہرآدمی کی زبان پر تمہارا نام ہوگا!!بس تمہارانام!!

نوجوان : سچ ! میں سپر اسٹار بن جاوں گا!!(اس کی نگاہیںمرگ نینی کے پستانوں کے شگاف میں اٹکنے لگی !!)

مرگ نینی : ہاں تم بہت جلد کامیابی کے آسمان چھونے لگو گے! آومیرے ساتھ اپنے سنہرے مستقبل کا جشن مناولو! پیو!!

اوراس نے گلاس میں شراب انڈیل کر نوجوان کی طرف بڑھایا ۔رفتہ رفتہ نوجوان کے اندر بھی نفس کازور بڑھنے لگا۔

نوجوان : ایسا ہے تو لاواور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر کے ، اس نےاپنی بانہیں مرگ نینی کے سامنے پھیلادیں۔

مرگ نینی : (صوفے سے اٹھ کراس کی بانہوں میں سماتے ہوئے) او میرے ہیرو ، تم نے تو مجھ پر جادو کرڈالاہے!اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی !

اوروہ دونونخواہشات کی تیز رو میں بہنے لگے ۔ ایک دوسرے کو بانہوں میں جکڑ لیا۔ لب سے لب جوڑ کر ایک دوسرے کو بھینچنے لگے۔ لباس کی بندشوں سے آزاد ہوکر صوفے پر دراز ہونے لگے کہ

کہ جبھی ناٹک کار یمدوت کی طرح پرکٹ ہوگیا ۔ چیخ کر کہا ، ’’دھتکار ہے تم دونوں پر!!‘‘

لیکن وہ چونکے نہیں!نہ ایک دوسرے سے الگ ہوئے ۔ انھوں نے شرم سے سر بھی نہیں جھکایا ۔

ناٹک کار : (نوجوان سے) خبر دار پھر کبھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو!وہ حشرکر ونگاکہ خون کے آنسو روئے گا!پاگلوں کی طرح سرپیٹتاپھرے گا!!دفع ہو ، دور ہویہاں سے!! (اورپھر مرگ نینی سے) تجھے لاج نہیں آتی ۔کم سے کم اپنی عمرہی کالحاظ کر!!

مگر ناٹک کارتعجب میں پڑگیا۔ نوجوان وہاں سے ٹلا نہیں ۔ الٹے غضب ناک نگاہوں سے اسے گھورنے لگا ۔مرگ نینی بھی ناگن کی طرح پھنکارنے لگی۔

مرگ نینی:		تم حاسد ہو ،تم سے ہماری خوشیاں نہیں دیکھی جاتیں! !اور تم یہ بار بار مجھے میری عمر کا احساس کیوں دلاتے ہو ۔ہاں یہ مجھ سے عمر میں چھوٹا ہے ۔ بہت چھوٹاہے ۔ لیکن میناس سے پیار کرتی ہوں اور یہ مجھ سے پیار کرتا ہے ۔ پیار میں عمر نہیں دیکھی جاتی ، دل دیکھے جاتے ہیں ۔ اور ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو !! کون سے تم بھی دودھ کے دھلے ہو ۔ جاو ، اپنا کام کرو ۔

یہ کہہ کرمرگ نینی نے ایک بار پھر نوجوان کی طرف بانہیں پسار دیں ۔ نوجوان بھی با نہیں پھیلاکر اس کی طرف بڑھا ۔دونوں ایک دوسرے میں ضم ہوگئے ۔

اور تب ناٹک کار مسکرایا ۔ اپنے بازووں کو موڑ کر ہتھیلیونسے پکڑتے ہوئے بولا ۔

ناٹک کار:		توسن! (چہرے کا رنگ بدلتے ہوئے) مرگ نینی یاد کر جب تو میرے ساتھ بھاگ رہی تھی ، تو اس وقت اپنے گاوں کو مڑمڑ کردیکھ رہی تھی ۔ سسکیانبھر رہی تھی ۔ میں تجھے دلاسہ دے رہاتھا ۔ تجھے تیرے سنہرے مستقبل کی جھلکیاں دکھا رہا تھا ۔ یاد آیا !!اس وقت میری نگاہ تیری گدرائی ہوئی چھاتی پر جاٹکی تھی ۔ مینے دیکھا ،تیری چھاتی چڑھی ہوئی ہے ۔میں سمجھ گیاتھا کہ کیاماجرا ہے !!

مرگ نینی:	(	بپھرتے ہوئے)کیاماجراتھا ؟ اپنے بچے کوچھوڑ کرتیرے ساتھ بھاگ آئی تھی ،یہی نا !!

ناٹک کار :		ہاں تجھے تو سب یاد ہے !! مگر کیا جانتی ہے ،تیراوہ بچہ (تھوڑے توقف کے بعد) کہاں ہے ؟

مرگ نینی : (مرگ نینی کا چہرہ زرد ہوجاتا ہے ۔وہ بیتاب ہو اٹھتی ہے) کیاوہ زندہ ہے ؟میرابیٹا زندہ ہے!! کہاں ہے وہ ؟ تم جانتے ہو کہاںہے وہ ؟

ناٹک کار: ہاں ،(اتراتے ہوئے) میں جانتا ہوں ۔میں جانتاہوں تیرا بیٹا کہاں ہے! !

مرگ نینی: (بے صبری سے) کہاں ہے ؟ بتاونا ، کہاں ہے ، میرابیٹا ؟

ناٹک کار: (سر اٹھا کرمسکراتے ہوئے نوجوان کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) یہ ہے!!

اور اس کے ساتھ ہی بجلی کے ایک کڑکے سے ناظرین کے دل دہل گئے ۔ آنکھیں خیرہ ہوگئیں ۔ موسیقی کی گونج کے ساتھ نوجوان کے قدم پیچھے ہٹتے گئے ۔ لال ، پیلی ،نیلی ، ہری روشنی کبھی اس کے ہراساں چہرے پر اور کبھی نوکیلے چمکدار قلم پر ، کبھی مرگ نینی کے بے رنگ چہرے پر اور کبھی ٹوکری میں رکھی ہوئی چمکتی دمکتی چھری پر منعکس ہونے لگی !!

ناٹک کار مسکراتاہوا ان چاروں کو باری باری دیکھنے لگا ۔ کہانی جذبات کی سب سے شدید مقام پر پہنچ گئی ۔ ہال میں سکتہ کاعالم تھا ۔ ناظرین دم بخودہوگئے ۔ ان کا تجسس نقطہ او ج کو پہنچ گیا ۔'اب کیا ہوگا ؟ 'یہ سوال ان کے دل ودماغ پر چھا گیا ۔

اور تب اچانک مرگ نینی زورزور سے قہقہہ لگانے لگی ۔ قہقہے کی آواز کچھ دیر تک فضا میں گونجتی رہی ۔ناٹک کار کی مسکراہٹ دھیرے دھیرے کافور ہوتی گئی ۔وہ حیراں پریشاں اسے دیکھنے لگا ، سوچنے لگا ، شاید اس سچائی کی تاب نہ لا کر وہ پاگل ہوگئی ہے ۔ نوجوان بھی اسے حیرت سے تاک رہا تھا ۔

اور تب مرگ نینی چٹکی بھرتے ہوئے بولی ،''خوب کہانی گڑھی ہے ، تونے!!
ہماری محبت کے خون کرنے کااچھا حربہ اپنایا ہے!! حاسد ہے ، خود غرض ہے۔ تو
مکار ہے۔ مجھ سے اپنی ہوس نکالتا آیاہے ۔مجھ سے اپنی ہوس نکالناچاہتا
ہے ۔جھوٹا ہے تو۔دغاباز ہے۔ اب میں تیرے جال میں نہیں پھنسنے والی۔ تیرے
فریب میں نہیں آنے والی۔(پھر نوجوان کی طرف بانہیں پھیلاتے ہوئے) اس شیطان
کی باتوں پر مت جا۔ میرے گلے لگ جا۔ برسوں کی پیاس بجھادے ۔''

نوجوان گم صم کھڑا رہا ! حواس باختہ کبھی ناٹک کار اور کبھی مرگ نینی کا
چہرہ دیکھتا رہا۔ کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ ناٹک کار کی طرف
بڑھا۔اسے گھورتے ہوئے کہا ،''ناٹک کار ،تیری یہ کہانی بڑی پرانی ہے! ہزاروں برس
پہلے سفوکلس نے بھی ایسی ہی ایک کہانی گڑھی تھی اوردنیاکا عظیم ترین ناٹک
کاربن گیا۔ لیکن مجھے ایڈی پس بننے کا شوق نہیں۔ میں ایڈی پس نہیں ،میں
ایڈی پس نہینبن سکتا۔ہاہاہا '' وہ قہقہہ لگاتاہوا مرگ نینی کی طرف لپکا اور اس کی
چھاتی سے چپک گیا !!اور پھر

ناٹک کار: (سامنے آکرناظرین کودیکھتے ہوئے)آہ ! یہ کیسا المیہ ہے ! کیسی ٹرجڈی
ہے یہ !زندگی تومجھے کس موڑ پرلے آئی ہے!!(ہاتھ اٹھا کرآسمان کی
جانب دیکھتے ہوئے) اے ایشور ،یہ کیساانرتھ ہے! کیساانرتھ ہورہا
ہے!! کیسا انرتھ ہے یہ !!

اس کے بعدناٹک کارسینہ کوٹتے ہوئے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ چلا چلا کر
رونے لگا ۔ اور تبھی ایک شور اٹھا ،'' ناٹک کار ،ہٹ جا سامنے سے! ابے ، ہٹتا کیوں
نہیں ؟ ہٹ سامنے سے !! دیکھنے دے ،ہمیں ،دیکھنے دے!!!''

ناٹک کارکی آنکھیں پھٹ گئیں۔اس کے چہرے پررنگ برنگی کرنیں ناچنے
لگیں۔ پیشانی پر جمی پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ وہ دیوانہ وار کپڑے پھاڑتاہوا

ڈائنگ ٹیبل کی طرف بڑھا۔ پھل کی ٹوکری میں رکھی چمکتی دمکتی چھری کے دستے پر گرفت مضبوط کی۔ تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر چھری چھوڑ کر میز کے پاس آیا۔ نوکیلے قلم کو ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا۔ اور پھر ایک دم سے دونوں قلم کو مٹھیوں میں دبوچ کر زوردارچیخ ماری ، ''سفوکلس! سفوکلس!!اب تیری یہی سزا ہے!!!"

اورتبھی سے ایک چاک دامن بوڑھاخون کے آنسو رو رہاہے ! اس شہر میں سر پیٹتا پھر رہاہے!!

* * *

(یہ کہانی سفوکلس کے ڈرامے 'اڈیپس' پر مبنی ہے ، جسے آج بھی دنیا کا عظیم ترین المیہ ماناجاتاہے۔)

(ذہنِ جدید ،نئی دہلی ،جون تااگست ، 2009)

ڈوبتے سورج کا منظر

جب پو پھٹتی اور پرندے چہچہاتے ہوئے اپنے اپنے گھونسلوں سے نکلنے لگتے ، تو وہ دونوں بھی اپنے اپنے گھروں سے نکل پڑتے ۔ بوڑھا لنگی گنجی پہنے ، کندھے سے گمچھا لٹکائے ،ایک ہاتھ میں کھرپی اوردوسرے میں داواٹھائے !بڑھیا بدن پر سفید ساڑی لپیٹے ، ایک ہاتھ میں بکری کاپگہا ، دوسرے میں رسی کا گچھا تھامے ۔دونوں ننگے پاوں ، کچی گلیوں اور سرسبزپگڈنڈیوں سے گزرکر جھیل کنارے پہنچتے ۔بوڑھا جھیل کی دائیں جانب سے لپکناشروع کرتااور بڑھیا جھیل کی بائیں جانب سے ۔اور جب دونوں ایک دوسرے کے رو برو آجاتے تو اپنی اپنی رفتار کم کردیتے ۔ ایک دوسرے کو تکتے ۔ بوڑھاہنس دیتا ،بڑھیا مسکرادیتی۔اور پھر دونوں اپنی اپنی زمین کو چلے جاتے ۔دونوں کی زمینیں آس پاس تھیں۔ بوڑھے کی زمین پر آم ، جامن ، ناریل ، کٹھل اور تاڑ کے کچھ پیڑ تھے۔ بڑھیا کی زمین پر کیلے ، پپیتے ،سپاری اور امرودکے کئی درخت تھے۔ بوڑھا اپنی زمین میں آکر کھرپی سے مٹی ڈھیلی کرتا ،گھاس اور خودروپودے اکھاڑتا۔ داوسے پیلے پتے اورخشک ٹہنیاں کاٹتا چھانٹتا۔

بڑھیا اپنی زمین میں آتی ،بکری کی کھونٹ زمین میں گاڑ کر کنکرپتھر چنتی۔ ٹوٹی ہوئی شاخوں اور پتوں کو بٹور کر گٹھر باندھتی ۔

سو آج بھی وہ دونوں یہی کر رہے تھے کہ بڑھیا نے دیکھا ، بوڑھے کی سانسیں تیز ہو گئی ہیں ۔ کھرپی ، داواس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئے ہیںاور وہ دانتوں سے ہونٹ دباکر ، چھاتی پکڑے آہستہ آہستہ زمین پر پسرتاجارہاہے ،تو وہ بھاگی ہوئی آئی ۔اسے سہارادے کر درخت کے چھاوں تلے بٹھائی ۔آنچل سے ہوا دیتے ہوئے پوچھی ، ’’کیاہوا ، میاں ؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ؟‘‘

بوڑھے نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں کہا ، ’’نہیں ،کچھ نہیں ، بس یوں ہی!!‘‘

’’کچھ نہیں ہوا ! توپھر اس طرح چھاتی پکڑ کر کیوں پسر گئے ؟ پسینے پسینے ہو رہے ہو!!‘‘ بڑھیا نے ڈرمائی انداز میں پوچھا۔

’’بس ذرا سر چکراگیاتھا!!شاید پریشر ہائی ہو گیاہے!!‘‘ بوڑھے نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

اتناسنناتھاکہ بڑھیا کھلکھلااٹھی ،بولی ، ’’کیاکہاپریشرہائی ہو گیا ہے!!کبھی کبھی میرے سنگ بھی ایساہی ہوتاہے ، سر چکرانے لگتاہے ، پاونلڑکھڑانے لگتے ہیں!!مگر ڈاکٹر کہتاہے ، کہ میرا پریشر لوہو گیا ہے!! عجیب بات ہے ،بڑھنے پر بھی سر چکراتاہے اور گھٹنے پر بھی!!‘‘

اور وہ دونوں ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگے ۔بکری اکیلی کھڑی ممیاتی رہی!!

اور ایک رات جب موسلا دھار بارش ہورہی تھی ،زوروں کی بجلی کڑک رہی تھی ، اونچے درخت اور گھنے پیڑ ہوا کے جھونکوں سے نبردآزمائی کررہے تھے ،سائیں سائیں کی آواز سے خوف وہراس کاما حول بن گیاتھا کہ اچانک کنڈی کھڑ کھڑانے کی

آواز آئی ۔ بوڑھا بستر میں سمائے کچھ پڑھ رہا تھا ۔ حیرت میں پڑ گیا ۔بدبداتا ہوا تھا ،''کون ہوسکتا ہے ، اس وقت!اس آندھی ،بارش میں" !!

جب اس نے دروازہ کھولاتوہکا بکا رہ گیا ۔ سامنے بڑھیا بکری کا پگھا تھامے کھڑی تھی ، سمٹی سمٹائی ، نظریں جھکائے ، تر بتر!!

بوڑھا کچھ دیر یوں ہی ہکابکا کھڑا رہا ۔بڑھیا بھی سمٹی سمٹائی کھڑی رہی ۔ اور جب بوڑھے کے حواس درست ہوئے تو اس نے بڑھیا سے اندر آنے کو کہا ۔

بڑھیا اندر آئی ۔ بوڑھے نے النے سے گمچھا کھینچا ۔اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا ،''تم ، اس وقت ؟"

یہ سنتے ہی بڑھیا کی گرفت بکری کے پگھے پر ڈھلی پڑگئی ۔ بکری اسارے کے ایک کونے میندبک گئی ۔

بڑھیا سے کوئی جواب نہ بن پایا ۔وہ سینے سے گمچھا چمٹائے بت بنی کھڑی رہی ۔ اور جب بوڑھے نے سوال دہرایا تو بڑھیا کپکپاتے لہجے میں بولی ، ''ڈڈڈر لگتا ہے میاں! بڑا ڈر لگتا ہے"!!

بوڑھے نے غور کیا بڑھیا کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں ۔ وہ آگے بڑھا ۔ دروازے کے باہردائیں بائیں جھانکتے ہوئے لا پرواہی سے پوچھا ، ''ڈر ! کس کاڈر ؟'' باہربارش اور بھی تیز ہوگئی تھی ۔ تند ہوا کا جھونکا اٹھنے لگاتھا ۔

بڑھیا کے ہونٹ پھر لپلپائے اور ایک لجلجی سی آواز ابھری ،''موت کا!!''

بجلی کے ایک کڑکے نے بوڑھے کا دل دہلادیا ۔ بوڑھا لرزہ براندام ہوگیا ۔ ماتھے پر پسینے کی چھوٹی چھوٹی بوندیں ابھرآئیں ۔اس بڑھیا کے الفاظ دہرائے ،" موت کا ڈر!!'' اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے بڑھیا کو تکنے لگا ۔ بڑھیا بھیگے آنچل کاگولا بناکر

آنسو پونچھنے لگی ۔ منہ پررکھ کرسسکیاں دابنے لگی ۔ ایک بار پھر زور سے بجلی کوند گئی ! دونوں کے دل پھر دہل گئے ۔ اور پھر یکایک بوڑھے کے ہونٹ ہلے ۔ ایک سوال ابھرا ، ''اچھا ،بی بی !ہم ایک سنگ نہیں جی سکتے ؟"

یہ سننا تھا کہ بڑھیا کی جیسے پوبارہ ہوگئی !! اس کی تمام بے اطمینانی جاتی رہی ۔

اور تب انھوں نے ایک وعدہ کیا ،'' ہم کبھی مرنے کی بات نہیں کریں گے ۔بس جیئں گے ۔جب تک جیتے رہیں گے !"

اور اب سے وہ دونوں ساتھ جینے لگے تھے !!

-دو-

اور اب جب پو پھٹتی اور پرندے چہچہاتے ہوئے اپنے اپنے گھونسلوں سے نکلنے لگتے ، تووہ دونوں گھر سے نکل پڑتے ۔ بوڑھا لنگی قمیض پہنے ، کندھے سے گمچھا لٹکائے ۔ ایک ہاتھ میں کھرپی اور داواٹھائے ۔ بڑھیا کرتی اوررنگین ساڑی زیبِ تن کیے ، ہاتھ میں بکری کاپگہا اور رسی کا گچھالیے ۔دونوں چپلیں پہنے ۔کچی گلیوں اور پکی سڑکوں سے گزرکر جھیل کنارے پہنچتے ۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے جھیل کی دائیں جانب سے لپکنا شروع کرتے ۔ اپنی اپنی زمین میں پہنچ کر اپنے اپنے کام میں جٹ جاتے ۔ بوڑھا کھرپی سے مٹی ڈھیلی کرتا ،گھاس اورخود روپودے اکھاڑتا ۔ داوسے پیلے پتے اورخشک ٹہنیاں کاٹتا چھانٹتا ۔ بڑھیا بکری کی کھونٹ زمین میں گاڑ دیتی ، کنکرپتھر چنتی ۔ ٹوٹی ہوئی شاخوں اور پتوں کو بٹور کر گٹھر باندھتی ۔

وہ دونوں اس روز بھی یہی کر رہے تھے کہ بوڑھے کا فون بج اٹھا ۔

کان سے فون لگاتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئے ۔

نیو یارک سے بیٹے کا فون تھا!!

بوڑھا کبھی گاوں کے پاٹھ شالے میں معلم تھا۔ آمدنی قلیل تھی ،لیکن اس نے بیٹے کو کبھی اس کااحساس ہونے نہیں دیا۔بیٹا ذہین تھا۔ڈاکٹری پاس کر کے امریکہ چلا گیا اور پھر وہیں کاہورہا۔ کچھ دنوں بعد گاوں لوٹاتویہ بھانڈا پھوٹا کہ اس نے ایک پاکستانی نژاد عورت سے شادی کر لی ہے!!ماں باپ کو دکھ تو ہوا تھا لیکن انھوں اس کا اظہار کرنا بے سود سمجھا۔الٹے ڈانٹ پلائی کہ بہو کو سنگ کیوں نہیں لایا۔اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگلے برس وہ اسے ساتھ لائے گا۔ لیکن واپس جانے کے بعد تو وہ جیسے لاپتہ ہوگیا۔باپ نے دل پر پتھر رکھ لیا ، لیکن ماں بیٹے کی جدائی برداشت نہ کر سکی۔ بستر سے ایسی لگی کہ پھرنہ اٹھ سکی ۔ وہ ماں کی وفات پر آیاتھا ، اپنی بیوی کو ساتھ لایاتھا !!مگر چہارم کے بعد ہی لوٹ گیا۔

بیوی کی موت کے بعد بوڑھے کو تنہائی ڈسنے لگی تھی۔دل میں ایک ہی سوال ابھرتا تھا ، ’’کیا اب وہ کبھی نہیں آئے گا ، میری موت پر بھی نہیں ؟ ‘‘

اس روز بھی جب وہ زرد پتے اورخشک ٹہنیاں کاٹ چھانٹ رہا تھا تواس کے دل میں وہی سوال ابھر رہا تھا کہ اچانک موبائیل بج اٹھا!!اس نے حیرت سے موبائیل کی اسکرین دیکھی تو خوشی سے من جھوم اٹھا۔مگر دوسرے ہی پل مرجھاگیا۔دل میں سوال ابھرا ، ’’اتنے دنوں بعد بیٹے کومیری یاد آئی! کیوں آئی ؟‘‘

بوڑھے کایہ سوال بے معنی نہ تھا۔گلوبلائزیشن کا دور دورہ تھا۔دنیا تیزی سے بدل رہی تھی ۔بیٹااس بات سے بخوبی واقف تھاکہ ہندستان دنیا کے نقشے پر ایک بڑی طاقت بن کر ابھر رہاہے ۔ ایسی طاقت کہ بڑے بڑے ممالک بھی پیچھے چھوٹ جائےں گے ،اور یہ کہ اس کے آبائی گاونکے قریب ایک نیا ٹاون شپ بن رہا ہے ۔وہاں اس کی پشتینی زمینینتھیں جہاں اس نے ایک نرسنگ ہوم بننانے کا منصوبہ تیار کیا۔

-تین -

اور اب جب پو پھٹتی اور پرندے چہچہاتے ہوئے اپنے اپنے گھونسلوں سے نکلنے لگتے ، تووہ دونوں گھر سے نکل پڑتے - بوڑھا لنگی قمیض پہنے ، کندھے سے گمچھا لٹکائے - ایک ہاتھ میں کھرپی اٹھائے -بڑھیا انگیا ، کرتی اوررنگین ساڑی زیبِ تن کیے - ایک ہاتھ میں داواور رسی کا گچھالیے - دونوں چپلیں پہنے - پختہ راستوں اورپکی سڑکوں سے گزر کر جھیل کنارے پہنچتے - ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے جھیل کی دائیں جانب سے لپکناشروع کرتے - اپنی اپنی زمین میں پہنچ کر اپنے اپنے کام میں جٹ جاتے - لیکن کسی کا اب کام میندل نہیں لگتا - بوڑھا بیٹے بہو اور پوتے پوتی سے ملنے کا خواب دیکھنے لگتا - بڑھیا تنہائی کے کالے بادل چھٹ جانے کے خیال سے مسرور ہونے لگتی -اور پھر وہ دونوں اپنے اپنے کام چھوڑ کرایک دوسرے کے پاس آجاتے اور ہنس ہنس کر گفتگو کرتے -سو آج بھی کر رہے تھے کہ بڑھیا نے تشویش ظاہر کی ،''اچھا ،اگر وہ میرے بارے میں پوچھے گا ،تو کیاکہو گے ؟"

بوڑھے نے بے دریغ کہا ،''وہ پوچھے گا ؟ کچھ نہیں پوچھے گا- جس دیش میں وہ رہتاہے وہاں یہ بڑی بات نہیں ،نہ یہ بری بات سمجھی جاتی ہے-وہاں تو بہت سے لوگ ہیں جو شادی بیاہ نہیں کرتے ،اور بچے بھی پیدا ہو جاتے ہیں- "

بڑھیا مسکراکر بولی- اس کی مسکراہٹ میں حیرت کا کچھ شائبہ بھی تھا ، ''کہیں تمہارے بیٹے نے بھی"

بوڑھے نے بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا ،''جانتی ہووہ پورے آٹھ سال بعد آرہا ہے - امریکہ میں بہت بڑا ڈاکٹر ہے!! بڑا مصروف رہتاہے- دم لینے کی فرصت نہیں ملتی !! اور ہاں! ایک پوتی ہے ، میری- جب وہ پچھلے بار آیا تھا تواتنی سی تھی ، ایک سال کی- بڑی پیاری ،نیلی نیلی آنکھیں ،سنہرے بال ، گوری چٹّی ، ایک دم میم !! اور ایک پوتا بھی ہے -میں نے دیکھانہیں ہے ، مگر!!"

"مگر وہ چھ سات سال کاہوگیاہوگا !! بڑھیا ڈرامائی انداز میں بولی ، ''ارے ، بابا ،یہ سنتے سنتے تو میرے کان پک گئے ہیں۔ بس دعا کرتی ہوں کہ وہ سلامتی سے پہنچ جائیں۔"

اور وہ سب سلامتی سے دم دم ائیرپورٹ پر لینڈ کر گئے۔ جب ان کی ٹیکسی قاضی نذرالاسلام ایوینو سے گزر رہی تھی ،توبیٹے نے کھڑکی سے باہر دیکھااوردیکھتا رہ گیا ۔ وہ جب پچھلی بار آیا تھا تو سڑک کے دونوں جانب سنسان
جنگل ،جھاڑیاں ،پوکھراوردلدلیں تھیں ، اب وہاں فلک بوس عمارتوں کاسلسلہ قائم ہوگیاتھا۔ رستوراں ، ہوٹلس ، اسکوٹروں اورموٹر گاڑیو ں کے شو رومس اورشاپنگ مالس بن گئے تھے۔ وہ دنگ رہ گیا۔رگھو ناتھ پور کے پاس شاندار فلائی اور دیکھا توتعجب میں پڑ گیا۔ گاڑی جب بائیں طرف مڑی تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔ دوردور تک درختوں کا نام و نشاں نہ تھا۔ تاحد ِنظر زمیں ہی زمیں تھی۔ بڑے بڑے گریڈر مٹی ہموارکررہے تھے۔

وہ زیرِ لب مسکرایا۔اسے اپنا خواب شرمندہ تعبیر ہوتا نظرآیا۔ جب گاڑی گاوں کے پاس پہنچی تو اسے مزید خوشی ہوئی کہ پوکھر تالاب ہموار ہوگئے
تھے۔پگڈنڈیانپکی سڑکونمیں تبدیل ہوگئی تھےں ۔ مٹی ،پھوس اور کھپریل کے مکانات گنتی کے بچے تھے ۔

اور جب ٹیکسی دروازے پر آلگی تو بوڑھالپکتا ہوا باہر آیا۔ لڑکے بالے کودیکھاتو پھولے نہ سمایا۔ بیٹے کو سینے سے لگایا۔بہو کو دعائیں دیں۔ پوتے پوتی کو تھرتھراتی بانہوں میں جکڑ ے پیار کرنے لگا۔ بڑھیا ایک کونے میں کھڑی یہ مسرت آمیز منظر دیکھ رہی تھی ۔ آنچل سے خوشی کے آنسوپونچھتی ہوئی پھر دھیرے دھیرے رسوئی کی طرف چلی گئی ۔

دن کے کھانے سے جب سب فارغ ہو چکے اور جب بڑھیا پھرسے رسوئی میں چلی گئی تو بیٹے نے پوچھا ،''ابّا ،یہ عورت کون ہے ؟"

بوڑھے نے کہا ،'' دوست ہے میری ۔"

یہ سن کربیٹے بہو کی بھوئیں تن گئیں ۔وہ ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے ۔

اور تبھی بوڑھے نے گفتگو کارخ موڑا ۔ بچوں سے مخاطب ہوا ،''ارے دادا ،تجھے ابھی تک جھال لگ رہی ہے ؟'' پھرمٹی کا بھانڈاپوتے کی طرف بڑھا تے ہوئے کہا ،''لے رس گلے کھا!! تیرے ملک میں ملتے ہے ایسے سفید نرم ملائم رس گلے "

پوتا لکنت آمیز لہجے مینبولا ،'' ہمارا امریکہ سب ،ملتا!رس گولا بھی ملتا!!"

پوتی نے کہا ،'' یو ،اسٹوپیڈ ،رس گولا ،نو ،رس گلا!!"

اس کے ساتھ ہی قہقہوں سے سارا گھر گونج اٹھا ۔

۔چار۔

اوراب جب پو پھٹتی اور پرندے چہچہاتے ہوئے اپنے اپنے گھونسلوں سے نکلنے لگتے ، تووہ دونوں بھی گھر سے نکل پڑتے ۔ بوڑھا پاجامہ قمیض پہنے ، کندھے پر کشمیری شال لٹکائے ۔ بائیں ہاتھ میں پوتی کا ہاتھ تھامے ۔بڑھیا ریشمی جمپرشلوار زیبِ تن کیے ، دائیں ہاتھ سے پوتے کی کلائی پکڑے ۔ دونوں کے دونو نپیروں میں جوتاموزہ ڈالے ۔ پختہ راستوں اور پکی سڑکوں سے گزر کر جھیل کنارے پہنچتے ۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر جھیل کی دائیں جانب سے لپکناشروع کرتے ۔ اپنی اپنی زمین میں پہنچ کر اپنے اپنے کام میں جٹ جاتے ۔

پوتے پوتی اچھل اچھل کر درخت سے کبھی پھل توڑتے ،کبھی پتے توڑتے ،کبھی ڈالیاں پکڑ کر جھولا جھلتے ۔کبھی دوڑ کر بوڑھے کے پاس آتے اور اس کی پیٹھ پر لد جاتے ۔ کبھی بھاگ کر بڑھیا کے پاس جاتے اور اس کی چھاتی سے لگ جاتے ۔سچ پوچھئے تو اب وہ دونوں یہاں کام کرنے نہیں آتے تھے بچوں کے ساتھ کھیلنے آتے تھے ۔ سووہ کھیل رہے تھے ۔

اور اُس روز جب بڑھیا ڈیوڑھی میں بیٹھی سبزیاں بنارہی تھی ،اور بہو اس کے پاس بیٹھی ساگ کے ڈنٹھل توڑ رہی تھی ؛ توبیٹا باپ کے کمرے میں بیٹھا اپنامدعا کہہ رہا تھا ، ''ابّا ،میں یہاں ایک نرسنگ ہوم کھولنا چاہتاہوں ۔ آپ کی رائے!!''

"میری رائے !!''باپ نے چونکتے ہوئے کہا ،''میری رائے کی کیاضرورت ہے ، تمہیں جو اچھا لگتاہے کرو!!"

"مگرابّا ،اس کے لیے زمین درکار ہے !!''بیٹے کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی ۔

"زمین ، ہاں ہاں ہے نا ، زمین !''باپ کے لہجے میں اداسی جھلکنے لگی ،'' مگر صرف تیرہ کٹھے ہی بچی ہے ۔سڑک کے اس پار والی ساری زمینیں ایکوئرہوچکی ہیں ۔ "

"لیکن ابّا اسے رجسٹری کروانی ہوگی ۔'' بیٹے نے نظریں جھکا کر کہا ،''میرے نام پر ،تبھی میرایہ پروجیکٹ پاس ہوسکے گا ۔گیفٹ ڈیڈ بنانے سے اسٹامپ خرچ کم آئے گا"

"تو اس میں پریشانی کیا ہے ، بنوالو ایک گیفٹ ڈیڈ ! چلو کل رجسٹری آفس چلتے ہیں ۔'' باپ نے بے پروائی سے کہا ۔

اور دوسرے دن زمین کی رجسٹری ہوگئی ۔پر مسئلہ اب بھی پوراحل نہیں ہوا تھا ۔ نرسنگ ہوم کے پروجیکٹ کے لیے کم سے کم ایک بیگھ زمین درکار تھی ۔

یعنی چھ سات کٹھہ زمین کم پڑ رہی تھی - ان کی اپنی زمین کے شمال میں سڑک اور مغرب میں جھیل تھی -بیٹے نے پوچھا ،'' ابّا ،مشرق والی زمین کس کی ہے ؟ ''

باپ خاموش رہا -آنگن میں دونوں بچے کھیل رہے تھے - پوتی اچھل اچھل کرپیڑ سے امرود توڑ نے کی کوشش کررہی تھی -پوتا بکری کا کان پکڑ کرکھینچ رہاتھا - بکری بے چاری ممیاتی ہوئی ادھر ادھر بھاگ رہی تھی - بوڑھا چلاتا ہوا باہر آیا - پوتے کے سامنے اکڑو بیٹھ کر سر میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا ،''دادا ،کیاکررہے ہو -دیکھو ، اس کی سینگ کتنی نوکیلی ہے -'' اور پھر پوتے کے پیٹ میں انگلی ٹیک کر کہا ، ''اس میں بھونک دے گی ، بڑی شریر ہے ، سمجھے -"

پوتی اب بھی اچھل رہی تھی -بوڑھا ہنسا - اسے مخاطب کرکے بولا ،'' اوریہ دیکھو! میم صاحب کو!! امریکہ میں رہتی ہے اور ایک امرود نہیں توڑ سکتی !! ''

اس کے بعد بوڑھے نے چار امرود توڑے - ایک پوتی کو تھما کراس کے گال تھپتھپائے - دوسرا پوتے کو دے کر پیشانی پر بوسہ لیا - ڈیوڑھی میں آکر ایک امرود بہو کو دیا اور مسکراتے ہوئے بڑھیا سے کہا ،''تیرے تو دانت ہلتے ہیں !! '' یہ کہہ کر ہنستا ہوا وہ اپنے کمرے میں چلا آیا - امرود بیٹے کے سامنے رکھ کر شفقت سے کہا ، ''لے ،بیٹا کھا !!''

بیٹا کرکٹ بال کی طرح انگلیوں کے درمیان امرود نچانے لگا - اس سے پہلے کہ وہ اپنا سوال دہراتا ،بوڑھا کمرے سے کھسک لیا -

دوسرے دن جب سب ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے ، توبیٹے نے پھر زمین کی بات چھیڑی ،''ابّا ،آپ نے بتایانہیں مشرق والی زمین کس کی ہے ؟'' بوڑھے نے برتن اور منہ کے درمیان نوالا معلق رکھ کر بیٹے کو دیکھا -

اس کی طبیعت الجھنے لگی -بہو اور بڑھیا ایک دوسرے کو دیکھنے لگے -

بیٹے کا لہجہ بوجھل ہوگیا۔بولا ،''ابّا ،اگر وہ زمین نہیں ملی تو نرسنگ ہوم بنانے کا میرا خواب ادھوراره جائے گا۔"

باپ نظریں جھکائے بیٹھاتھا۔بڑھیا ،اب ، اسے تکنے لگی تھی۔

تھوڑی دیر کے لیے فضا میں خاموشی چھائی رہی۔ پھر بیٹے جھلا کر بولا ، "میری سمجھ میں نہیں آرہاہے ! اس میں اس طرح چپی سادھ لینے والی کون سی بات ہے ؟زمین جس کی ہے ، میں اس سے خریدنا چاہتا ہوں ۔ مفت کی تھوڑے مانگ رہاہوں!!

بڑھیا ہنوز بوڑھے کو تاک رہی تھی۔ بوڑھے کا چہرہ پیلا پڑتا جارہاتھا۔پیشانی پر پسینے کی بوندیں جمنے لگی تھیں۔بوڑھے کی حالت دیکھ کربڑھیا گھبراگئی ۔ اٹھی اور ہانپتی کانپتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔تھوڑی دیر بعد کاغذ کا ایک پلندہ لاکر بوڑھے کے سامنے رکھااور بولی ،''یہ ہیں اس زمین کے کاغذات !اب یہ میرے کس کام کی! نرسنگ ہوم بنے گا ۔بچے ہمارے سنگ رہیں گے ۔ اس سے زیادہ ہمیں اور کیا چاہئے ؟"

اوردوسرے دن مشرق والی زمین کی بھی رجسٹری بیٹے کے نام ہوگئی ۔

تمام پیڑ پودے کاٹ دیئے گئے۔ چاروں طرف اونچی دیوارچن دی گئی۔ لوہے کا پھاٹک لگاکر ایک نوٹس بورڈ ٹھونک دیاگیا:

No Admission

Site for Nursing Home

اور دوسرے ہفتے بیٹا بیوی بچوں سمیت امریکہ لوٹ گیا۔ جاتے جاتے کہہ گیا کہ جلد واپس آئے گا اور نرسنگ ہوم کی بنیاد رکھے گا ۔

کچھ دنوں تک تو بہو اور بچوں کے فون آتے رہے ۔دو ایک مرتبہ بیٹے سے بھی بات ہوئی مگر دھیرے دھیرے سلسلہ منقطع ہوتا گیا۔

۔پانچ ۔

اوراب جب پو پھٹتی اور پرندے چہچہاتے ہوئے اپنے اپنے گھونسلوں سے نکلنے لگتے ، تووہ دونوں بھی گھر سے نکل پڑتے ۔ بوڑھا پاجامہ قمیض پہنے ، کندھے پر کشمیری شال لٹکائے۔ ایک ہاتھ میں واکنگ اسٹیک لیے۔بڑھیا ریشمی جمپرشلوار زیبِ تن کیے ، دائیں ہاتھ کی شہادت انگلی میں پھاٹک کی کنجیاں نچاتے ہوئے ۔ دونوں کے دونوںپیروں میں موزہ جوتا ڈالے ۔ پختہ راستوں اورپکی سڑکوں سے گزر کر جھیل کنارے پہنچتے ۔ باونڈری وال پکڑ کر تھوڑادم لیتے ۔ پھر ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر جھیل کی دائیں جانب سے لپکنا شروع کرتے ۔ اپنی زمین کے پاس پہنچ کر پھاٹک کا تالا کھولتے اورچھاتی پھلائے زمین کا کئی چکر لگاتے ۔سو آج بھی لگارہے تھے کہ اچانک بوڑھے کو محسوس ہوا جیسے کوئی کہہ رہا ہے ، '' اب تو یہاں کیوں آتا ہے ؟ یہ زمین تیری نہیں!! ''

بوڑھا گمبھیر ہوگیا۔ چلتے چلتے رک گیا۔بڑھیا کا ہاتھ پکڑ کر بولا ،''چلو ، گھر چلتے ہیں!! ہمیں اب یہاں نہیں آنا چاہیئے ۔''

بڑھیاسمجھ گئی کہ بوڑھا بچوں کی جدائی سے بوکھلا گیا ہے۔ اس کی انا اس پر حاوی ہوگئی ہے ۔مگراس نے کچھ کہا نہیں۔چپ چاپ بوڑھے کے ساتھ چلنے لگی۔

اور جب بوڑھاپھاٹک کا تالا لگا رہاتھا ،تو بار بار حقارت سے نوٹس بورڈ دیکھ رہا تھا ، ''No Admission'' ، کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

اِدھرآئے دن زمین کو لے کر تنازعہ کھڑا ہونے لگاتھا۔ جلسے ، جلوس ،چکّہ جام ، ریلی ، مہاریلی ،ہڑتال ،بند ،توڑ پھوڑ !!

”کسان کی زمین واپس کرو! بھومی بچاودیش بچاو!!“ کے نعرے لگنے لگے ۔

غرض یہ کہ حالت دن بدن بد سے بد تر ہوتی گئی ۔ بڑے بڑے صنعت کار پس وپیش میں پڑ گئے ۔ بعض نے اپنے پروجیکٹ رد کریئے ۔بعض نے رد کرنے کا من بنالیا ۔

کئی سال گزرچکے ہیں ۔ نیو ٹاون شپ پروجیکٹ ہنوز تعطل کا شکار ہے ۔

اُدھر امریکہ میں خاموش بیٹھا تماشہ دیکھ رہاہے ۔اِدھربوڑھا باپ مجبور نراس فون بجنے کے انتظار میں گھل رہا ہے ۔

۔چھ ۔

اب بھی پو پھٹتی ہے اور پرندے چہچہاتے ہوئے اپنے اپنے گھونسلوں سے نکل پڑتے ہیں ،مگروہ دونوں گھر سے نہیں نکلتے ۔ بوڑھا پاجامہ قمیض پہنتا ہے ،نہ کندھے سے کشمیری شال لٹکاتا ہے ۔ واکنگ اسٹیک بھی نہیں اٹھاتا ۔ کھرپی اور داوتو پہلے ہی زنگ آلودہوگئے تھے ۔ اسارے کے ایک کونے میں پڑے ہوئے ہیں ۔ بڑھیا بھی رنگین ساڑی ، انگیا ، کرتی نہیں پہنتی ، نہ ریشمی جمپرشلوار زیبِ تن کرتی ہے ۔ پھاٹک کی کنجیوں کو ہاتھ نہیں لگاتی ۔ بکری مر گئی ۔اب کسی کو جوتا موزہ اور نہ چپل پہننے کی حاجت پیش آتی ہے ۔ جھیل کی دیوار پکڑکر اب کوئی دم نہیں لیتا ۔ دائیں جانب سے کوئی لپکتاہے ،اور نہ کوئی پھاٹک کا تالا کھولتاہے !!

بڑھیاروزانہ شام کو آنگن میں چارپائی بچھاتی ہے ۔ سہارا دے کربوڑھے کو بٹھاتی ہے ۔بوڑھا بڑھیاکاہاتھ پکڑ کرہانپتے ہوئے کہتاہے ،’’میرے سنگ رہنے سے تجھے کیا ملا؟ الٹے تیری زمین بھی چلی گئی ۔اور میرے بعد تو پھر سے اکیلی ہو جائے گی ۔ “

بڑھیا انگلی دکھاکرڈپٹتی ہے ،’’ پھر وہی بات !!بھول گئے ،ہم نے وعدہ کیا تھا ۔ ہم کبھی مرنے کی بات نہیں کریں گے ۔ بس جیئں گے ۔ جب تک جیتے رہیں گے !!‘‘

بوڑھا خاموش ہوجاتاہے۔بڑھیاکو کچھ دیر ٹکٹکی باندھے دیکھتاہے اور پھر رونی صورت بناکر وہی بات دہراتاہے ،''میرے بعد تو پھر سے اکیلی ہو جائے گی "

بڑھیا کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ سسکیاں دابے کہتی ہے ،''من کیوں چھوٹا کرتے ہو! وہ آئے گا! ضرور آئے گا!!''

اور بڑھیا اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے۔بوڑھا بھی بڑھیاکی ہتھیلی مٹھیونمیں جکڑ لیتا ہے۔اور پھر دونونافق کی جانب تاکنے لگتے ہیں۔ دھندلائی ہوئی نظروں سے سورج ڈوبنے کا منظر دیکھتے رہتے ہیں!!

سو آج بھی دیکھ رہے ہیں!!!

* * *

(ایوانِ اردو ،دہلی ، مارچ 2009)

ایم ایم ایس

وہ غسل خانے سے نکل کر قدآدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ تولیہ اینٹھ کر دونوں سروں کو پکڑااور ہوا میناچھال اچھال کر گیلے بال جھٹکنے لگی ۔ وہ جب اس طرح اپنے بال جھٹکتی تھی تو اسے چھاتی اورکولھوں پر زلزلے کے جھٹکے محسوس ہوتے تھے ۔ نس نس میں برقی رو دوڑجاتی تھی ۔ عجب سا ایک سرورچھانے لگتاتھا ۔ اور پھر سرور و انبساط کی کیفیت کا بھرپور لطف لینے کے لیے وہ تولیے کو اسکپنگ روپ بنالیتی ۔رسی پھلانگنے کا کھیل کھیلنے لگتی ۔ وہ یہ کھیل اس باربھی کھیل رہی تھی ۔

اس کاسڈول جسم اپنے حشر سامانیوں کے ساتھ اچھل رہا تھا۔وہ آئینے میں اپنے خوبصورت جسم کا جائزہ لے رہی تھی اور سوچ رہی تھی ، "اڑتیس سال کی عورت اور ایک جوان بیٹی کی ماں ہونے کے باوجودمیرے جسم کے کس بل میں اب تک کوئی فرق نہیں آیا ۔ نہ چھاتی جھولی ہے ، نہ کمرپر چربی کی تہیں جمی ہیں۔پیٹ پر اسٹریچ کا نام ونشان نہیں !! اور پھر وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بدبدائی ،'' دیکھنے والے ، کسی کنواری لڑکی کا جسم سمجھتے ہوں گے !! ''

اور پھررفتہ رفتہ زلزلے کے ہلکے اور معتدل جھٹکے شدید بھونچال کی شکل اختیار کرنے لگے ۔تولیہ اسکپنگ روپ کی طرح تیزی سے ناچنے لگا ۔اب وہ زور زور سے جست بھر رہی تھی ۔ اور جب وہ اس طرح جست بھرتی تھی ،تواسے اپنی دوشیزگی کازمانہ یاد آجاتاتھا:

-۲-

گاوں میں وہ اسی طرح زور زور سے رسی پھلانگنے کاکھیل کھیلاکرتی تھی ۔ اس روز بھی کھیل رہی تھی کہ لطفی نے دیکھ لیا ۔ وہ پوجا کی چھٹیوں میں گاوں آیاتھا ۔اس نے جب یہ نظارہ دیکھا تواس کے اوسان خطاہوگئے ۔ فوراً ایک پیڑسے چپک گیا ۔ دم سادھے عنفوانِ شباب کی اٹکھیلیاںدیکھتارہا ۔ اندرانی نے اس روز کچھ زیادہ ہی جست بھر لی تھی ۔ اس کے پیر لڑکھڑاگئے ۔ اس سے پہلے کہ وہ زمین پر گرجاتی ، لطفی پیڑ کی اوٹ سے نکلااور بانہیں اس کے گرد پھیلادیں ۔اندرانی مجمدار ، لطفی گائن کی بانہوں میں ایسی لڑھکی کہ لڑھکتی چلی گئی ۔

اس کے لیے اسے بھاری قیمت چکانی پڑی ۔ ماں باپ ، گاوں محلہ ، گھر خاندان سب تیاگناپڑا ۔بھاگ کر کلکتہ آنا پڑا ۔ دونوں نے شادی کرلی اور ازدواجی زندگی کا سکھ بھوگنے لگے ۔

لطفی کلکتہ کے ایک ڈا یگنا سٹک سنٹر میں ای سی جی ٹیکنیشین تھا ۔ مریضوں کاایسیجی نکالنے کبھی کبھی آوٹ ڈور جایاکرتاتھا ۔ ایک دن اپنے گھرکے قریب کسی مریض کاای سی جی نکالنے گیا تھا کہ نئی نئی بیوی کی کشش اسے دن میں بھی گھر کھینچ لے گئی ۔ اندرانی کام سے فارغ ہوکر بستر پر لیٹی سستارہی تھی ۔لطفی کو دیکھ کرپہلے تو چونک پڑی ۔ دفعتاً اٹھ کر بیٹھ گئی ۔ پھرہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ سجاکر بولی ،’’کیونجی! اب دن میں بھی چین لینے نہیں دوگے ،کیا ؟‘‘

لطفی نے مشین کوہوا میں لہرتے ہوئے کہا ،''میڈم ، میں دل کی دھڑکنیں ناپتا ہوں ۔ادھر سے گزررہاتھا ۔سوچا ،آپ کے دل کی دھڑکنیں بھی ناپتاچلوں!!کہئے ، نپوائیں گی اپنے دل کی دھڑکنیں ؟"

"میرے دل کی دھڑکن ناپنے کے لیے اس پرانے ریڈیوکی ضرورت نہیں ؟ '' اندرانی کے لہجے میں عشوہ گری کاشائبہ ابھر آیا تھا ۔

"میری جان یہ ریڈیو نہیں ہے ۔دل کی دھڑکن ناپنے کی مشین ہے ۔ آوتمہارے دل کی دھڑکنیںناپ دوں!!''

اندرانی آنکھیں مٹکاکر کبھی مشین اور کبھی لطفی کودیکھنے لگی ۔بولی ،'' اچھا ، اس سے دل کی دھڑکن ناپی جاتی ہے ؟ذرامیں بھی دیکھوں تو!!''

اور وہ کھڑی ہوگئی ۔لطفی کے ہاتھ سے مشین لے کر تپائی پررکھی اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی ۔جھک کر مشین دیکھتے وقت جب اس کا پلوڈھلک گیااورپستانینابل آئیں تو دھڑکن ناپنے والے کا دل دھڑک اٹھا ۔ اور پھردونوں دل دھڑکنے اور دھڑکانے کا کھیل کھیلنے پر آمادہ ہوگئے ۔

اس کے بعد جب بھی وہ کسی مریض کا ایسیجی نکالنے آوٹ ڈور جاتا ، توکسی نہ کسی بہانے گھر چلاآتا ۔ دونوں دل دھڑکنے اورد ھڑکانے کا کھیل کھیلتے ،پھر ایک دوسرے کی دھڑکنیں ناپتے ۔

ایک دن یہ کھیل کھیلتے وقت اندرانی نے کہا ،''کیوں نہ ہم بھی اپنی مشین خرید لیں ۔ ڈاکٹروں سے کانٹکٹ کرکے ای سیجی نکالنے کااپنا دھندہ شروع کردیں ۔ ویسے بھی میں دن بھر گھر میں بیٹھی رہتی ہوں ۔ تمہاراہاتھ بٹادیاکروں گی ۔"

لیکن لطفی نے اندرانی کی تجویز کا خاطر خواہ کوئی نوٹس نہیں لیا ۔ Diagnostic Centreکے تئیں وفاداری کا ثبوت دیتا رہا ۔ دن گزرتے رہے ۔ اور پھران

کے گھر چاند سی ایک گڑیاآئی ۔ بیٹی کی پیدائش کے بعد اندرانی رفتہ رفتہ خانگی ضرورتوں میں الجھتی چلی گئی۔ لطفی بھی اپنے کام کاج میں سنجیدہ ہوگیا ۔اور جب بیٹی سال بھر کی ہو گئی ، تو دونوں نے خوشی خوشی اس کا جنم دن منایا۔ اسے گھمانے باہر لے گئے۔ دونوں بس سے اتر رہے تھے ۔ اندرانی پیچھے تھی۔ ایک ہاتھ سے بیٹی کو چمٹائے اور دوسرے سے شوہر کا ہاتھ تھامے ۔ شوہر نے زمین پر قدم رکھا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک بس تیزی سے آئی اور اسے تنکے کی طرح اڑا لے گئی۔ کنڈکٹر نے پوری قوت سے اندرانی کو پکڑ لیاورنہ وہ بھی بچی سمیت اس کے ساتھ کھنچی چلی جاتی۔لطفی بس کے پہیے سے پس چکا تھا ۔ اندرانی حواس باختہ خون میں لت پت شوہر کی لاش دیکھتی رہ گئی۔جب اس کے حواس درست ہوئے تواس کے سامنے پہاڑ سی زندگی تھی۔ بیٹی کا مستقبل تھا۔ اور جب سوگ و ماتم کا دور ختم ہواتو اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ بدنصیبی کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ گھر کے پاس ایک چھوٹا سا نرسنگ ہوم تھا۔ اس نے نرسنگ ہوم والوں کی مدد سے ایک مشین خریدی اور گھر گھر جاکر مریضوں کا ای سی جی نکالنے کا کام کرنے لگی۔جب کہیں سے بلاوا آتا تو ایک ہاتھ میں بیٹی کو اٹھاتی اور دوسرے میں مشین۔اورجہدبقا کو چل دیتی ۔

بیٹی کی زندگی سنوارنے کی خاطر اندرانی جدوجہدکرتی رہی ۔پیٹ کاٹ کاٹ کر تنکا تنکا جمع کرتی رہی ۔ وقت کا پہیہ گھومتا رہا ۔ کوئلے کے چولہے کی جگہ کراسن تیل کے اسٹو نے لی ، پھر کراسن تیل کے اسٹو کی جگہ گیس اوین نے ۔ چٹائی سے چوکی اور پھر پلنگ تک کاسفر طے کرنے میں اس کے تلوے چھلنی ہوگئے۔ اب گھر میں آسائش کے سبھی سامان جمع ہو گئے تھے۔ الماری ، صوفہ ، فریج ،ٹیوی واشنگ مشین سب تھا۔ لیکن ٹی وی پر صرف دوردرشن اور نیشنل چینل ہی آتے تھے۔اور وہ بھی صرف خبروں اور دیگر گھریلو پروگرام کے وقت ہی کھلتی تھیں۔ اندرانی کوبیٹی کی تعلیم و تربیت کے ساتھ کوئی سمجھوتہ گوارا نہیں تھا۔

اور جب عقیلہ اسکول میں پڑھتی تھی ،تواندرانی اسے سڑک تک چھوڑنے آتی اور بس میں سوار کرکے نرسنگ ہوم کو دوڑ لگاتی ۔دن بھرتلاشِ معاش میں یہ گھر ، وہ در پھرتی رہتی۔ موبائل بجتے ہی مشین لے کر کھڑی ہوجاتی ۔ لیکن کہیں بھی رہتی اسکول بس آنے سے پہلے پہنچ جاتی۔ بیٹی کو لے کر گھرآتی۔ دودھ گرم کرتی ، ٹوسٹ بناتی اور گیس اوین پر ادھن چڑھاکر عقیلہ کو آوازدیتی۔پھررسوئی ہی میں کھڑے کھڑے اس کے ساتھ شام کا ناشتہ کرتی۔ جب ادھن پھوٹ جاتا تو اس میں چاول دھو کرڈال دیتی۔ پریشر ککر میں دال چڑھا تی۔اس دوران میں عقیلہ برتن دھو دیتی ،سبزیاں کاٹ دیتی۔ اورپھروہ عقیلہ کو پڑھانے بیٹھ جاتی ۔اس کا ہوم ورک کراتی۔ اسے زور زور سے سبق یاد کرنے کو کہتی ،اور بیچ بیچ میں اٹھ کررسوئی کا جائزہ لیتی ۔

اندرانی میں غضب کی چستی تھی۔ ڈیل ڈول ،طور طریقے ،عزم ارادے سب بے مثال تھے۔ جب شوہر زندہ تھا ، تووہ ایک وفاشعار بیوی تھی ۔شوہر کی موت کے بعد جھانسی کی رانی بن کر میدانِ کار زار میں کود پڑی ۔اب بیٹی ہی اس کا سب کچھ تھی۔ وہ اس کا پورا پورا خیال رکھتی۔اس کی پرورش میں رتّی برابربے توجہی نہیں برتتی تھی۔ اس کے طور طریقے کا باریکی سے جائزہ لیتی۔ کوئی کمی بیشی دیکھتی توفوراً تنبیہ کرتی ۔

اب عقیلہ کالج جانے لگی تھی ،پھر بھی اسے اکیلی نہ چھوڑتی تھی ۔روزانہ کالج پہنچانے جاتی ۔ مگر ایک دن اس کا دل دھک سے ہوگیا۔

عقیلہ کالج کے کمپاونڈ میں اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ بیٹھی گپیں مار رہی ہے۔ اندرانی سے رہا نہ گیا۔وہ ان کے قریب چلی گئی۔ جب عقیلہ نے ماں کو دیکھا توسٹپٹاگئی۔ کہنے لگی ، ”ماں ،یہ ریباہے اوریہ سجوئے ،یہ اسیماہے اوریہ دیپانکر ،یہ شبانہ ہے اور یہ اکرم ، اور یہ ہے شیبو ،شیب چرن داس۔“

ریبانے کہا ،'' آنٹی ،اچھاہوا آپ مل گئیں ۔ آئندہ مہینے ہمارے کالج کا سلور جبلی فنکشن ہے ۔ ایک ڈراما بھی ہوگا ۔ ہم عقیلہ کو اس میں بھاگ لینے کے لیے کہہ رہے ہیں ، مگر یہ کہہ رہی ہے کہ آپ سے پوچھ کربتائے گی ۔آپ پلیز اجازت!''

''بیٹے ، مجھے ذرا جلدی ہے ۔ ضروری کام نکل آیاہے ۔ بعد میں بات کروں گی ۔ '' یہ کہہ کر اندرانی کٹّی کاٹ گئی ۔گھر آکر بیٹی کو سمجھایا ، ''ڈراما ،ناچ گانااچھی چیزیں ہےں ، لیکن پڑھائی کے بعد ۔اور یہ کیا تو کالج پڑھنے جاتی ہے کہ دوستوں کے ساتھ اڈّہ مارنے ۔تو سمجھ دار ہے ۔ میری بات سمجھ رہی ہے نا! دن زمانہ ٹھیک نہیں ہے!!''

اور پھر دھیرے دھیرے اندرانی کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا ۔وہ بڑبڑانے لگی ، ''ویسے بھی تیرے سماج والے ابھی اتنے اُداروادی نہیں ہوئے ہیں کہ عورتوں کو ان چیزوں کی آزادی دے سکیں ۔ مجھے مانتے ہیں ، تعریفیں بھی کرتے ہیں ،لیکن بیٹی کواپنا نہیں سکتے! کیوں کہ ماندوسرے دھرم کی ہے!!''

اور اس کے بعد اندرانی مزید چوکناہوگئی ۔اس نے عقیلہ پر نگرانی بڑھادی ۔اب وہ اسے کالج چھوڑنے آتی توکچھ دیر تک پھاٹک پر کھڑی دیکھتی رہتی اور چھٹی ہونے سے کچھ دیر قبل ہی پہنچ جاتی ۔ حتی کہ وہ اب اسے گھر پر بھی تنہانہیں چھوڑتی تھی ۔ جب بیٹی گھر پر ہوتی تو وہ کام پرجانے سے پرہیز کرتی ۔کال آنے پر ٹال دیتی ۔ غرض یہ کہ وہ اپنی بیٹی کو ایک آئیڈئل انسان بناناچاہتی تھی ۔ وہ عقیلہ کو اعلیٰ اوصاف ، نیک کرداراور اچھی صحت سے مزین کرناچاہتی تھی ۔ ہر طرح کا گرسکھاناچاہتی تھی ۔ بڑوں کی تعظیم ، چھوٹوں سے شفقت ، انسانوں سے ہمدردی ، ذمہ داریوں کا احساس سبھی کچھ !! یعنی وہ تمام اچھائیاں جو وہ خود حاصل نہ کرسکی تھی ،اپنی بیٹی میں دیکھنا چاہتی تھی ۔ اندرانی میں ایک کمزوری تھی ،جس کااسے شدیداحساس بھی تھا ، '' اگرمجھ میں یہ کمزوری نہ رہی ہوتی تو میں اپنا

گھر ، اپنا گاوں ، اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر ایک اجنبی کے ساتھ کبھی نہ بھاگتی !!‘‘
لہٰذاوہ اپنی بیٹی کو اس کمزوری سے پاک رکھنا چاہتی تھی ۔ اسے بے حیائی اور بدچلنی کی ہوا بھی لگنے نہیں دینا چاہتی تھی ۔اب تک تو بیٹی نے ماں کا بھرم قائم رکھاتھا ۔ کالج میں عہدِ جدید کی رنگینیاں دیکھنے کے باجود خود کوبچائے رکھاتھا ۔ ایسا محسوس ہوتاتھا کہ اسے جدید دور کی ہوا چھو کر نہیں گزری ہے ۔اور اندرانی کو یہ یقین ہوچلاتھا کہ اب اس کی بیٹی دوستوں اورسہیلیوں کے جھمیلے میں نہیں پڑتی ہے ۔ کالج صرف پڑھنے کے لیے جاتی ہے!!

۔۳۔

اب بھی تولیہ اسکپنگ روپ کی طرح تیزی سے ناچ رہاتھا ۔ اندرانی کا جسم پوری طرح بھونچال کی زد میں تھا ۔پسینے کی دھار کان کی لَو تک پہنچ چکی تھی ۔پیشانی پر بوندیں پھوٹ رہی تھیں ۔ گھنیرے زلفوں سے پانی کے قطرے آئینے اور دیواروں پربکھر رہے تھے ۔ پیٹھ ، پستان ،کندھے ، بازو سب بھیگ چکے تھے ۔وہ اب بھی آئینے میں اپنا اچھلتا مچلتا بدن دیکھ رہی تھی ۔ تمام نشیب و فراز کا جائزہ لے رہی تھی ۔ اور جبھی اچانک اسے ایسا لگاکہ اس کے جسم کے متوازی ایک اور جسم حائل ہوگیاہے ،جس پر عہد شباب کے سارے نقوش ابھرے ہوئے ہیں ۔ اندرانی نے دل ہی دل میں کہا ،’’کوئی فرق نہیں! انگ ، رنگ ، ڈھنگ سب میری ہی طرح ہے ۔بالکل زیروکس کاپی !! صرف باپ کی طرح ناک تھوڑی بھاری ہے ،اورنانی کی طرح آنکھیں ذراکھچی ہوئیں ۔‘‘

تولیہ اب بھی تیزی سے گھوم رہا تھا ۔ اس کی نظریں ماں بیٹی کے جسموں میں نقطے شوشے کا فرق ڈھونڈ رہی تھیں کہ یکایک ٹیبل پر رکھاہوا موبائل بج اٹھا ۔اندرانی نے دیکھا ، اسکرین کی بتی جل رہی ہے ، لیکن آواز تھم چکی ہے ۔اور پھر دھیرے دھیرے تولیہ کی رفتار کم ہوتی گئی ۔ جسم میں برپاہونے والا بھونچال

بھی تھمنے لگا۔ ایک بار پھر موبائل بجنے کی آواز آئی ، اوراس کے ساتھ ہی بھونچال تھم گیا۔اندرانی نے تولیہ جسم کے گرد لپیٹ لیا اور موبائل اٹھا کر دیکھا۔اسکرین پر ڈاکٹر مکھرجی کا نام تھا ۔ اس نے موبائل کان سے لگا کر کہا ، ’’ہیلو!‘‘

دوسری جانب سے آواز آئی ،’’میڈم ،ایک ارجنٹ کیس ہے ۔ کم امیڈیٹ لی !!‘‘

”نو سر ، میں ابھی نہیں جا سکوں گی۔عقیلہ کی چھٹی کا ٹائم ہوگیا ہے۔آپ شفالی کو بلا لیجئے ، ساری ،پلیز ڈونٹ مائنڈ !!‘‘ یہ کہہ کراندرانی نے فون ڈسکنکٹ کردیا۔

۔۴۔

اورہاں! یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا کہ اندرانی نے لطفی سے شادی توکی تھی لیکن اپنا دھرم نہیں بدلاتھا۔گھر کے ایک کونے میں لکڑی کے طاق پر دیوی درگا اور ماں کالی کی تصویریں رکھی ہوئی تھیں ۔ کالے پتھر کاایک چھوٹاسا شیولنگ بھی تھا ، جس پر وہ ہرصبح گنگا جل ڈالتی ۔ دھوپ لوبان جلاکر ،گھنٹی سنکھ بجاکر پوجا کرتی ۔ ہونٹ اور زبان کی مدد سے ’لولو‘ کی آواز نکال کراُلو بھی دیتی ۔لطفی نے جیتے جی اس پرکبھی دباونہیں ڈالا کہ وہ مسلمان ہو جائے۔ اندارنی نے بھی عقیلہ کو اپنے دھرم کی جانب راغب کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی ۔ بلکہ اپنے شوہر کے مذہب کے مطابق ہی اس کی پرورش کی۔ مولوی صاحب سے قران پڑھوایا ۔ نمازیں سکھائیں۔ رمضان کے روزے رکھنے کی عادت ڈلوائی۔ اور وہ جب سیانی ہوگئی ،تو شریعت کے مطابق بیٹی کا نکاح کرانا چاہا۔کئی جگہیں باتیں چلائیں۔ کئی گھروں سے رشتے بھی آئے ، لیکن ہر بار ماں کا دھرم بیٹی کی خوشیوں کی راہ میں ناگ کی طرح پھن کاڑھے حائل ہو جاتا ۔پر اندرانی ہمت ہارنے والی عورت نہیں ۔وہ اب بھی اچھے رشتے کی تلاش میں لگی ہوئی تھی ۔ اسے یقین تھا کہ دولت کا منتر پھونک کر

وہ ایک نہ ایک دن مذہب کے ناگوں کورام کر لے گی ۔ اس لیے اب اس کے سر پر دولت جمع کرنے کا بھوت سوار ہوگیا !! ہر وقت کان میں موبائل ٹکائے پھرنے لگی ۔

۔۵۔

آج بھی اندرانی کچھ دیر پہلے ہی کالج پہنچ گئی تھی ۔آج بھی وہ گیٹ پر کھڑی ہرسو نظریں دوڑاتی رہی ۔ آج بھی جب اس نے اپنی بیٹی کودوستوں اور سہیلیوں کے ساتھ اڈّہ مارتے نہیں دیکھا تو من ہی من خوش ہوئی ۔اور جب بیٹی کلاس سے نکلی تو اس نے اس کے سر سہلائے ،پیشانی پربوسہ لیا اور اسے گھرلے آئی ۔

عقیلہ ہاتھ منہ دھونے غسل خانے میں داخل ہوگئی ۔اندرانی رسوئی میں چلی گئی ۔ اس نے اوین جلایا ۔ اس پر دودھ کی پتیلی رکھنے لگی کہ ٹیبل پر پڑا موبائل بج اٹھا ۔وہ دوڑی ۔ موبائل اٹھاکر دیکھا ۔اسکرین پراِن بکس میسج کی عجیب سی ایک علامت ہے ۔وہ اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگی ۔ اسی درمیان عقیلہ غسل خانے سے باہر آگئی ۔ اس نے بیٹی کو دیکھ کر کہا ،’’عقیلہ ،دیکھ تو یہ کیسا ایس ایم ایس آیاہے ۔ کھل نہیں رہا ہے ۔‘‘

بیٹی نے ماں کاہاتھ تھام کر اپنی طرف کھینچااور اسکرین پر نظریں جماتے ہوئے کہا ، ’’یہ ایس ایم ایس نہیں ، ایم ایم ایس ہے !! ‘‘

’’ایم ایم ایس ؟ ‘‘ اندرانی حیرت سے بیٹی کا چہرہ تکنے لگی ۔

’’ ہاں ، ملٹی میڈیا میسج!! ‘‘ اس کے بعداس نے کہا ،’’مینو بٹن دبایئے ۔ ‘‘

ماں نے مینو بٹن دبایا ۔

’’اب سلیکٹ دبایئے ۔ ‘‘

ماں نے سلیکٹ بٹن دبایا ۔

”اب دایاں ایرو والا بٹن دبایئے ۔دیکھیے ، ایم ایم ایس کااِن بکس آگیا ۔ اب سلیکٹ دبایئے ۔“

اور سلیکٹ بٹن دباتے ہی بھونچال آگیا !

چہرے پر زلف بکھیرے ، عریاں جسم ایک حسینہ رسی پھلانگ رہی تھی ۔ شہوت انگیز نسوانی آواز آرہی تھی ،’’تین روپے پرتی منٹ! آپ کے موبائل پر یہ سویدھا ا پلبدھ ہے“ !!

بیٹی کادل دہل گیا ۔آنکھیں نم ہوگئیں ۔ من ہی من جھنجلائی ، ’’چھی! شیبو تواتنا کمینہ نکلا!!‘‘

اورماں کا چہرہ زرد ہوگیا ۔ نظریں جھکائے من ہی من کھسیائی ، ’’اس بارپیسے زیادہ دیئے تھے ،مگراس طرح موبائل پر !!!‘‘

٭ ٭ ٭

(ایوانِ اردو ، دہلی ،اکتوبر 2009)

سر پھرا

کلیانی سوا گھنٹے کاراستہ تھا ،مگرمیں گیارہ بجے سے پہلے نہیں پہنچتا تھا ۔ دور سے آنے والے اکثر لوگوں کا یہی حال تھا ۔ دو چار مقامی اسٹاف تھے ، جو ہمارے پہنچنے تک کام سنبھال لیتے تھے ۔وقت پر کاونٹرس کھول دیتے ،فارم ایشو کردیتے اور کبھی کبھی دو چار رجسٹریشن بھی کردیتے تھے ۔ اس لیے پبلک اور اڈمنسٹریشن دونوں کی نگاہوں میں دفتر کی ساکھ بنی ہوئی تھی ۔ اسی طرح زیادہ تر اسٹاف ساڑھے چار بجے والی لوکل پکڑتے تھے ۔مگربرسات کے دنوں میں توان کی پو بارہ ہوجاتی تھی ۔ دیر سے آئے تو مینہ برسنے کا حیلہ !جلدی گئے تو ابر باراں کا بہانہ !! یعنی چت بھی اپنی پٹ بھی اپنی ۔گویا سب مزے میں چل رہا تھا کہ میرے تبادلے کا آرڈر آ گیا ۔اس بار بئیرک پور!

کلیانی کے مقابلے بئیرک پورقریب تھا ۔تقریباً نصف راستہ ! اس لیے یہاں ساڑھے دس بجے تک آسانی سے پہنچاجا سکتا تھا ۔ منگل پانڈے کے نام سے جڑا چھوٹا سایہ شہر دریائے ہگلی کے مشرقی ساحل پر واقع تھا ۔ یہاں سے ایک لمبی سڑک دریا ئے ہگلی کے متوازی چلتی ہوئی کلکتہ کو پہنچتی تھی ۔ بئیرک پور ٹرنک روڈ کے نام سے مشہور اس سڑک پرویسے توطرح طرح کی سواریاں دستیاب تھیں ، مگر دفتر جانے

والے لوگ ریل گاڑی کو ترجیح دیتے تھے ۔ ٹرین کی کثرت تھی ۔سیزنل ٹکٹ خرید لینے سے کرایہ بھی کم لگتا تھا ۔ یعنی مجموعی طور پر یہ تبادلہ میرے لیے خوش آئند تھا ۔لہٰذا ٹرانسفر آرڈر پاتے ہی میندوڑ پڑا ۔

ٹرین جب عمارت نما اسٹیشن میں داخل ہوئی اور ڈبے کے اندراندھیراغالب ہونے لگاتوسمجھ گیا کہ میری نئی منزل آگئی ۔پلیٹ فارم پر قدم پڑتے ہی دل باغ باغ ہوگیا ۔برسوں بعد اتنی قریب پوسٹنگ پائی تھی ۔

اسٹیشن سے دفتر قریب تھا ۔ میں نے پیدل چلنے کا تہیہ کیا ۔خراماں خراماں چلتا رہا ۔ تمام راستے سوچتا رہا ، پتا نہیں یہاں ارائیول ،ڈپارچر کی ٹائمینگ کیا ہوگی ؟ اسٹاف کیسے ہونگے ؟ کام کاج کا ماحول کیسا ہوگا ؟سیاسی دخل اندازی کی نوعیت کیسی ہوگی ؟

ان باتوں سے ذہن الجھائے چلا جارہا تھا ۔ جیسے ہی مین روڈ سے مڑکر گلی میں داخل ہوا ایک اونچی آواز نے مجھے چونکا دیا ، ’’کِتّا ٹِم ہوا ہے ، بابو ؟ “

گلی کی ایک جانب کھٹال تھا ۔ گائے ،بھینس بندھے جگالی کر رہے تھے ۔جگہ جگہ ٹاٹ کے پردے جھول رہے تھے ۔ سامنے بڑا سا پکّا نالا تھاجو پھوس اور گوبر سے اٹاہوا تھا ۔ نالے کے کنارے اوٹے پر ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا تھا ۔گھٹنے تک لنگی باندھے ، ادھ پھٹی گنجی پہنے کھینی کی تال ٹھونک رہا تھا ۔ میری نگاہ اس پر پڑی تو اس نے نگاہ میری آنکھوں میں ڈال دی ۔اور وہی سوال دہرایا ،’’کِتّا ٹِم ہوا ہے ،بابو ؟“

میں نے ٖاٹیچی بائیں ہاتھ میں تھام لی ۔ دائیں ہاتھ پر بندھی گھڑی دیکھی اور مسکراکر کہا ،“پونے گیارہ“!

جب دفتر کے پاس پہنچا تو دیکھا باہر لوگوں کی بھیڑ لگی ہے ۔ کچھ لوگ چہ میگوئیاں بھی کر رہے ہیں ۔

سناتھا کہ بیئرکپور محکمہ ایشیا کا سب سے بڑا محکمہ ہے ۔ لوگ نام رجسٹری کرانے دور دور سے آتے ہیں ۔ایسی حالت میں دفتر کے باہر اس طرح کی بھیڑ ناقابلِ گماں نہیں ۔مگر یہ چہ میگوئیاں ؟ بات کچھ پلّے نہیں پڑی ۔مگر جب دفتر میں داخل ہوا تو عقدہ کھلا ۔

نرمل باسو یہاں جونیئر افسر تھے ۔وہ میرے ساتھ پہلے بھی کام کر چکے تھے ۔ خلیق ،نرم مزاج اور سلجھے ہوئے انسان تھے ۔انٹھاون یا انسٹھ سال کی عمر تھی ۔دراز قد ،گورے چٹّے ،خوش پوشاک ،فلموں کے ہیرو جیسے لگتے تھے ۔ مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے ۔لپکتے ہوئے دروازے کوآئے اور مجھے اپنے کمرے میں لے گئے ۔میں نے دیکھا دفتر کے اندر ایک عجیب سکوت کا عالم ہے ۔کسی بڑے طوفان سے پہلے جیسا سکوت!

میں نے باسو صاحب پر ایک سوالیہ نظر ڈالی ۔تجربہ کار آدمی تھے تاڑ گئے ۔فرمانے لگے ،''بڑے صاحب چلے گئے ۔جاتے وقت چارج رائے چودھری صاحب کو دے گئے ۔ چودھری صاحب دوسری منزل پر بیٹھتے ہیں ۔آج انھوں نے ساڑھے دس بجے ہی اٹینڈینس رجسٹر اوپر منگوالیا ۔ دیبیس بابو آئے اور انھیں جب رجسٹر نہیں ملا توتن تنا اٹھے ۔فوراً فتویٰ جاری کردیا ،" کوئی کرمچاری اوپر نہیں جائے گا ۔رجسٹر نیچے لانا ہوگا ،نہیں تو پین ڈان اسٹرائیک !! ''

میں سمجھ گیاکہ چودھری صاحب حاضری سے متعلق سختی برتنا چاہتے ہیں ۔مگرلیٹ آنے والوں کو یہ پسند نہیں اس لیے وہ اوپر نیچے کایہ ایشو کھڑا کر رہے ہیں ۔لیکن مجھے ایک اوربات کا کھٹکالگا ۔

بنگلہ میں کہاوت مشہور ہے ،'پرتھم راترے ای بڑال مارا'(پہلی ہی رات میں بلی کو قتل کرڈالنا) ۔ یعنی شادی کی پہلی رات میں جب بلی 'میاو ں میاوں' کرتی ہے توشوہراسے قتل کردیتاہے ۔یہ دیکھ کر بیوی ڈر جاتی ہے ،اورپھر کبھی شوہر سے چوں چراں کرنے کی جسارت نہیں کرتی۔

شاید یہاں کچھ ایسا ہی منظر نامہ پیش کیا جارہا تھا۔میں نے پوچھا ،''باسو صاحب ، آپ سے دیبیس بابو کے کیسے تعلقات ہیں ؟"

انھوں نے جواب دیا ،'' بس ،ٹھیک ٹھاک ہےں۔"

"توآپ ان سے کہیے ، ہم لوگ چودھری صاحب سے بات کرتے ہیں۔آپ 'پین ڈان اسٹرائیک' واپس لے لیجئے ۔ باہر بھیڑ لگی ہے ۔ گھر کی بات گھرمیں رہے ۔اسی میں سبھوں کی بھلائی ہے۔"

باسو صاحب گئے ۔ دیبیس بابو کو پکڑ لائے ۔ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے ،''دیبیس ، نئے صاحب آئے ہیں۔"

دیبیس بابو نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔پھر کھکھر تے ہوئے قدرے خاکساری سے بولے ،''ساری سر ،آپ آج آئے ،اور آج ہی یہ جھمیلا ہوگیا۔"

میں نے انھینبیٹھنے کااشارہ کیا۔جب وہ بیٹھ گئے تو باسو صاحب نے ہمارا مدعا بیان کیا۔دیبیس بابو نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ پھر اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ بولے ،''سر ،آپ تو جانتے ہیں کہ ہماری ایسوسی ایشن جن برودھی کام کوبڑھاوا نہیں دیتی۔ہم نہیں چاہتے کہ اتنے سارے لوگ جو دور دور سے یہاں آئے ہیں خالی ہاتھ لوٹ جائیں۔اور آپ نے جب کہہ دیا کہ حاضری کھاتا نیچے آجائے گاتو میں کرم چاریوں سے کہہ دیتا ہوں ، وہ کام شروع کردیں گے۔"

اور کام شروع ہوگیا۔جب دوسری منزل پر گیا تو دیکھا دروازے کے سامنے لکڑی کی ایک تختی ٹھونکی ہوئی ہے ،جس پرعہدے کے ساتھ جلی حرفوں میں لکھا ہے ،''دھیریندر چندر ناتھ رائے چودھری!"

چودھری صاحب کی جسامت ان کے نام کے مقابلے کسی طور کم نہ تھی۔بھاری بھرکم دھڑ ، بڑا سا کلا ،بھرے بھرے گال ،سر پر برف جیسے سفید بال ،گندومی رنگ ،موٹی ناک اور ناک کے نیچے کڑیل مونچھےں۔ آواز بھی کڑی تھی۔ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔مگر پڑھے لکھوں کی صحبت اختیار کرنے کا شوق رکھتے تھے۔جب میرے بارے میں سنا تو حاضری کھاتا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ،''لیجیے صاحب ،سنبھالیے۔مجھے اس آفت سے نجات دلائیے۔"

مجھے امید نہیں تھی کہ ان کے جیسا ڈیل ڈول والا شخص اتنی آسانی سے ہار مان جائے گا۔میں خاموش انھیں تاکتا رہا۔وہ فرماتے رہے ،''آپ تو دیکھ رہے ہیں۔ میرے جیسے جسم والے آدمی کے لیے ممکن نہیں کہ اٹینڈینس چیک کرنے کے لیے نیچے اترے۔ سال بھر نوکری ہے۔ ان سے الجھنا نہیں چاہتا۔ اب آپ آگئے ہیں ، سنبھالیے۔مگر صاحب ،ذرا سنبھل کر ، وہ حرام زادہ ،رائی کا پہاڑ بنادیتاہے "

اور اس دن سنبھالتے سنبھلتے شام ہوگئی۔ گھرواپس جانے کے لئے دفتر سے نکلا۔اسی گلی سے گزررہا تھا کہ اس آدمی پر نظر پڑی۔کھٹال کے دروازے پر کھڑا تھا ۔ ویسے ہی پھٹی پرانی گنجی پہنے ،ویسے ہی گھٹنے تک لنگی باندھے ۔مجھے دیکھتے ہی ہانک ماری ،''کِتّا ٹِم ہوا ہے ،بابو؟ "

"ساڑھے چار '' کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔کئی اسٹاف پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔مسکراتے ہوئے کانا پھوسی کر نے لگے ۔ میں نے ان پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔ ٹرین پکڑنے کی جلدی جو تھی۔

حالانکہ اسٹیشن کے مین گیٹ والی سڑک سیدھی دفتر کو جاتی تھی ۔لیکن گلی والا راستہ شارٹ کٹ تھا ۔ اس لئے اکثر لوگ اُسی راستے کو ترجیح دیتے تھے ۔

دوسرے دن بھی اُسی گلی والے راستے سے گزر رہا تھا کہ دیکھا وہ آدمی کمر سے گمچھا باندھے ناریل کے جھاڑو سے نالا صاف کر رہا ہے ۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی سیدھا کھڑا ہوگیا ، گمبھیر لہجے میں بولا ،''کِتّا ٹِم ہوا ہے ، بابو ؟''

میں تھوڑی دیر کے لیے ٹھٹک گیا ۔ اُسے اوپرسے نیچے تک نہارتارہا ۔وہی پھٹی پرانی گنجی ، گھٹنے تک اُٹھی ہوئی ویسی ہی لنگی ، پاوں میں پلاسٹِک کے جوتے ، لال رنگ کا وہی دھاری دارگمچھا ۔ وقت پوچھنے کا وہی انداز ۔

میرے لبوں پر مسکراہٹ جھلک اٹھی ۔دھیرے سے بولا ،'' پونے گیارہ ۔ “

اسے وقت تو بتا دیا اور شاید اسے تشفی بھی ہوگئی تھی ،لیکن ایک بے چینی نے مجھے آگھیرا ۔ حاضری کھاتا کے بارے میں کیا حل نکالوں ۔سوچا ،باسو صاحب نیچے بیٹھتے ہیں ، حاضری کی ذمہ داری انھیں سونپ دینے سے مسئلہ حل ہوجائے گا ۔ لیکن دفتر پہنچ کر جب باسو صاحب کے سامنے تجویز رکھی تو وہ بدک گئے ۔بولے ، ''صاحب ،مجھ بوڑھے کو اس جھمیلے میں نہ گھسیٹیں ۔ “

اور تب میں نے یہ طے کرلیا کہ صبح کو کچھ دیر نیچے بیٹھوں گا ۔ اٹینڈینس چیک کر لینے کے بعداوپراپنے کمرے میں جاوں گا ۔

کچھ دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا ۔

اب حاضری کھاتا اوپر میرے کمرے میں آجاتا تھا ۔ کوئی بکھیڑا نہیں ہوتا ۔یعنی کل ملا کر حالات کلیانی جیسے ہی ہو گئے تھے ۔

-دو -

رائے چودھری صاحب پیدل نہیں چلتے تھے ۔ رکشا پر آتے جاتے تھے ۔باسو صاحب کا مکان پاس تھا ۔لہٰذا انھیں ٹرین پکڑنے کی نوبت پیش نہیں آتی تھی ۔مگر اس دن انھوں نے مجھ سے کہا ،''چلئے ، آپ کے ساتھ اسٹیشن چلتا ہوں ۔ آج میرے بھانجے کی بیٹی کا 'مکھ بھات' ہے ۔نئی ہٹّی جاوں گا ۔ "

ہم باتیں کرتے ہوئے جب گلی میں داخل ہوئے تو دیکھا ، سامنے وہ شخص اپنے اُسی مخصوص لباس اور اُسی مخصوص انداز میں کھڑا کھینی مل رہا ہے ۔ ہاتھ پر ہاتھ پیٹ رہا ہے ۔ باسو صاحب نے کہا ، ''صاحب ، گھڑی دیکھ لیجئے ۔ "

پہلے تو مجھے ان کی بات سمجھ میں نہیں آئی مگر جب اُس آدمی نے وہی بے تکا سوال کیا ،''کِتّا ٹِم ہوا ہے ، بابو ؟'' تومجھے تجسس ہوا ،تاہم ظاہراًعدم توجہی برتتے ہوئے میں نے جواباً کہا ،''پونے پانچ ۔"

باسو صاحب کے چہرے پر جب معنی خیز ہنسی دیکھی تومجھ سے رہا نہ گیا ۔ پوچھ بیٹھا کہ ماجرا کیا ہے ۔

انھوں نے کہا ، ''یہ آدمی سنکی ہے ۔ ہر آتے جاتے آدمی سے بلا وجہ وقت پوچھتا رہتا ہے ۔اگر نہیں بتایئے ،تو گالیاں دیتا ہے ۔"

-تین -

دوسرے دن جب اسٹیشن پر اترا تو سوچا کیوں نہ سیزنل ٹکٹ بنوالوں ،اب تویہاں روز کا آنا جانا ہے ۔ کاونٹر پر بھیڑ جمی تھی ۔ ٹکٹ بنوا نے میں کافی دیر ہو گئی ۔ ٹکٹ لے کر خراماں خراماں چلتاہوا اُس گلی میں داخل ہوا تودیکھا حسبِ

عادت وہ باولا لنگی گنجی پہنے کھڑاکھینی مل رہا ہے ۔ میرے آگے آگے ایک صاحب چلے جا رہے تھے ۔انھیں دیکھتے ہی چلّایا ،''کِتّا ٹِم ہوا ہے ،بابو ؟''

اُس شخص نے رفتار برقرار رکھتے ہوئے جواب دیا ، ''سوا گیارہ !''

جب میں اس کے قریب سے گزرا تو وہی ڈھاک کے تین پات ،''کِتّا ٹِم ہوا ہے ،بابو ؟''

مگر مینجواب دیئے بغیر نظریں جھکائے چلتا رہا ۔ اس کا ردِعمل جو جانناتھا ۔

وہ بپھر اٹھا ،''جب ٹِم نہیں دیکھ سکتے تو گھڑیا کاہے کو لگات ہو ،بابو ؟ ''

میں نے کچھ نہیں کہا ۔مسکراتا ہوا بڑھتا گیا ۔

آفس میں ڈاک دیکھتے وقت اوپر سے آئے ہوئے ایک سرکلر پر نظر پڑی ۔اس میں حاضری سے متعلق ضروری آرڈر درج تھے ۔ دس بجے آفس میں داخل ہونے اور دس بج کر پندرہ منٹ کے اندرحاضری بنالینے کی بات کہی گئی تھی ۔ڈپارچر کے سلسلے میں بھی تاکید کی گئی تھی کہ پانچ بج کر پندرہ منٹ سے پہلے کوئی ملازم ڈپارچر کے لئے دستخط نہ کرنے پائے ۔یعنی نہایت سختی سے اس بات پرزور دیا گیا تھا کہ سوا دس سے پہلے دفتر آنا ہے اور سواپانچ بجے کے بعد دفتر سے نکلنا ہے ۔میں نے بڑے بابو کو بلا کر کہا کہ وہ دفتر کے سبھی لوگوں کو اس سرکلر پر سختی سے عمل پیراہونے کی ہدایت کردیں ۔دیبیس بابو سے بھی کہا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو سمجھا دیں ۔لیکن میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ دیر سے آنے والے دیر سے ہی آئیں گے اور بیسوں بہانے بنائیں گے ۔ پرانی عادت پرانے دھبے جیسے ہوتے ہیں چھڑائے نہیں چھوٹتے ۔

وہ لکیر کا فقیر بھی اپنی عادت چھوڑنے کو تیار نہ تھا ۔لوٹتے وقت اس گلی سے گزرا ، تو دیکھا ، کھٹال کے پاس پوال کے بورے سے کمر ٹیکے کھینی مل رہاہے ۔ آتے جاتے لوگوں سے ' ٹِم ' پوچھ رہا ہے ۔

جب مجھ سے پوچھا ،"کِتّا ٹِم ہوا ہے ، ب'ابو ؟'تومیں نے جھنلاہٹ میں گھڑی دیکھے بغیر ہی کہہ دیا ،''ساڑھے پانچ ۔"

"ارے بابو ،تنک گھڑیا تو دیکھا ؟"

میں نے جواب دینامناسب نہیں سمجھا ۔تیزی سے چلتا گیا ۔ گلی سے نکل کر جب مین روڈ پرآیا تو گھڑی پر ترچھی نگاہ ڈالی ۔ساڑھے پانچ بجنے میں اب بھی دس منٹ باقی تھے ۔

دوسرے دن گھر سے آدھے گھنٹے پہلے نکلنا پڑا ۔اسٹیشن سے لپکتا ہواچلنے لگا ۔رہ رہ کر گھڑی دیکھتا رہا ۔ جب گلی سے گزررہا تھا تو دس بج کر اٹھارہ منٹ ہو چکے تھے ۔مگر جب اس ستم گر نے پوچھ لیا ،"کِتّا ٹِم ہوا ہے ،بابو " ، تو میں نے جھٹ کہا ،''سوا دس ۔"

اس نے ناک بھوں سکیڑ لیے ۔ مجھے تیکھی نظروں سے دیکھنے لگا ۔

مگر میں کیا کرتا ، تین منٹ کم کہنا میری مجبوری تھی ۔نئی ہدایت کے مطابق مجھے دس بج کر پندرہ منٹ کے اندرہی دفتر پہنچنا تھا!!

سوا دس سے پہلے دفتر جانے اور سوا پانچ بجے کے بعد نکلنے میں ویسے تو کچھ دنوں تک تھوڑی پریشانی ہوتی رہی ، لیکن آگے چل کر مقررہ وقت پر آنے جانے کی عادت پڑگئی ۔اب میں اپنے ماتحتوں سے سینہ پھولائے کہہ سکتاتھااور اکثر کہنے بھی لگا تھا ،''اگر دیر سے آفس آنا عادت ہوسکتی ہے ، تو جلدی آنا بھی ایک عادت بن سکتی ہے ۔"

وہ خو گر بھی اپنی عادت پر اڑا تھا ۔آتے جاتے راستے میں اوروں کے ساتھ ساتھ مجھ سے بھی وقت پوچھتا رہتاتھا ۔اب میں دفترجاتے وقت گھڑی پر نظر ٹکائے بغیر ہی کہہ دیا کرتا ،"دس بج کر پانچ منٹ" اسی طرح واپس جاتے وقت اُس کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر مجھے یہ کہنے میں رتّی بھر کھوٹ محسوس نہیں ہوتی کہ ساڑھے پانچ بجے ہیں ۔اور اُسے بھی اب یہ شکایت نہیں ہوتی تھی کہ گھڑی دیکھے بنا ہی مینٹھیک ٹھیک وقت کیسے بتا دیتا ہوں ۔سچ پوچھئے تو اب اس سخت گیرکے وقت پوچھنے پر مجھے غصّہ بھی نہیں آتا تھا ۔شاید اس کی اسی سخت گیری نے مجھے بھی و قت کا پابندبنادیا تھا ۔

چودھری صاحب سے اب کسی کی جھڑپ نہیں ہوتی تھی ۔اٹینڈینس کو لے کر کوئی بکھیڑا کھڑا نہیں ہوتا تھا ۔دیبیس بابو بھی ٹھنڈے پڑ گئے تھے ۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا کہ برسات کا موسم آگیا ۔

گلی والے راستے میں پانی جمنے لگا ۔ چوپایوں کا فضلہ اِدھر اُدھر بہنے لگا ۔لوگ اس راستے کو ترک کرنے لگے ۔

اب ہم نے مین گیٹ والی سڑک سے آنا جانا شروع کردیا ۔ اب کوئی نہیں پوچھتاکہ کتنا وقت ہوا ہے ۔

تین چار مہینے کا وقفہ گزر گیا ۔برسات ختم ہوگئی ۔ لوگ پھر سے گلی والے راستے سے آنے جانے لگے ۔ میں نے بھی وہی راستہ اختیار کرلیا ۔ مگر اس سرپھرے کا کوئی اتاپتا نہیں ۔آتے جاتے عجیب سا احساس دل سے چپکا رہتا تھا ،"کیا ہوا ؟ کہاں گیا وہ شخص ؟"

۔چار ۔

ایک دن خرامانخرامانآفس جارہا تھا ۔مین روڈ سے آفس والی گلی میں داخل ہوا ۔کھٹال کے پاس سے گزرا ۔ٹاٹ کے پردوں کے پار نظریں دوڑائیں ۔مگر پوال اور مویشیوں کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا ۔ سامنے دو آدمی کھڑے باتیں کررہے تھے ۔دل چاہا کہ ان سے اس کے بارے میں پوچھوں ۔ مگر کھٹال کے پاس رک کر لوگوں سے ایک سر پھرے کے بارے میں پوچھنا مجھے گوارا نہ ہوا ۔ تجسس دبائے دفتر پہنچا ۔ حاضری کھاتے پر دس بجے کا وقت ڈال کر دستخط کرنے جارہا تھا کہ اچانک آواز آئی ، ’’کِتّا ٹِم ہوا ہے ،بابو ؟ “

مجھے لگا کہ وہ شخص کندھے سے گمچھا لٹکائے کھینی ملتا ہوامیرے سامنے کھڑا مسکرا رہا ہے !

میں نے جھٹ سے گھڑی دیکھی ، دس بج کر پچاس منٹ ہورہے تھے !!

شام کو لوٹتے وقت کھٹال کے پاس کھڑا ہوگیا ۔ نالے کے اوپر ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی ۔اس پر ایک بوڑھا بیٹھا بیڑی پی رہا تھا ۔ پاس ہی دو آدمی کنستر میں دودھ انڈیل رہے تھے ۔مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے بوڑھے سے اس باولے کے بارے مینپوچھ لیا ۔وہ تینوں مجھے گھورنے لگے ۔ کچھ دیر فضا میں خاموشی چھائی رہی ،پھر بوڑھے نے بجھتی ہوئی بیڑی کے دو لمبے لمبے کش لگائے ۔اور کہا ،’’بابو جی ، وہ پاگل تو مر گیا ۔“

اتنا سننا تھا کہ میرے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی ۔

دوسرا شخص کنستر کا ڈھکن بند کرتے ہوئے بدبدایا ،’’سالا مرے گا نہیں ! آندھی ہو یا برسات جب دیکھو کھڑا بھیگ رہا ہے ۔ آتے جاتے لوگوں سے پوچھ رہاہے ، ‘کِتّا ٹِم ہوا ؟ کِتّا ٹِم ہوا ؟’ بس ، ہوگیانیمونیا بخار اور پھر ٹیں !‘‘

اس کے لہجے میں طنز تھاجس نے مجھے اور بھی رنجیدہ کردیا ۔اتنارنجیدہ کہ میرے قدم سست پڑ گئے اور پانچ بجے والی ٹرین چھوٹ گئی ۔

اس واقعہ کو کئی سال بیت گئے ہیں ۔ صفحہ ہستی پر اُس سر پھرے کا کوئی وجود نہیں ،مگر آج بھی دستخط کرتے وقت حاضری کھاتے کے صفحے پروہ اکثر نمودار ہوجاتاہے ۔ پوچھ بیٹھتا ہے ،''کِتّا ٹِم ہوا ہے ، بابو ؟''

* * *

(سنڈے انڈین ، نئی دہلی ،نومبر2007)

کنگن

اس نے دروازے پر لٹکتے کڑوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالی ۔پھرڈور بیل کی طرف ہاتھ بڑھایا ۔

ویسے بھی اب کنڈیاں کھڑکانے کا دورکہاں رہا ؟ کڑے کھنکانے اور ان سے جھول جانے کا زمانہ تو وہ بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے ۔

وہ توان کڑوں کو اکھاڑ پھینکنا چاہتا تھا ۔مگر ان کی میخیں کواڑ میں اس قدر پیوست تھیں کہ بڑھئی کو کہنا پڑا ،''بابوصاحب ، رہنے دیجئے ۔ پلاّا کمزور ہو جائے گا ۔ آج کل کے لاکنگ سسٹم کا کیا بھروسہ ۔انھیں رہنے دیجئے گھر سرکچھت رہے گا ۔“

اور اسے بڑھئی کی بات مان لینی پڑی ۔

بچپن میں جب وہ کھیل کود کر گھر لوٹتا تودروازے پر کچھ دیر ٹھہر جاتا ۔ ان کڑوں کو نچاتا ۔کھنکاتا اور انھینپکڑ کر جھول جاتا ۔

ماں آہٹ پہچان لیتی ۔ ’کھٹ‘ سے کواڑکھول دیتی ۔وہ اپنی بانہیں پسار دیتا ۔ماں جگر پارے کو چھاتی سے چمٹا لیتی تھی ۔

لیکن اب وہ زمانہ نہیں رہا ۔ آہٹ پہچاننے والی ماں بھی نہیں رہی ۔اب تریشاہے جو محض گھنٹی کی آوازپہچانتی ہے ۔اسے سن کر ہی دروازہ کھولتی ہے ۔

دنیابدل گئی ۔ببھاش کے گھر کا نقشہ بھی بدل گیا ۔ سیمنٹ کی فرش کی جگہ رخام اور گرینٹ بچھ گئے ۔چھت ،دیواراورستونوں پر چونے کا لیپ نہیں رہا روغناب چڑھ گئے ۔ اب جھولتے تاردکھائی نہیں دیتے ۔ دیوارونمیں مدفون ہو گئے ہیں ۔ چھت سے لٹکنے والے بلب کی جگہ بریکیٹ پر نصب خوشنما قمقمے اور پنکھے کی جگہ ائیر کولر لگ گئے ۔ غسل خانے میں گلیز ٹائل ،واش بیسن ،کموڈ ،جھرنا ،شیشہ ، گیزر ، گیجٹ اورمختلف شکل کے شیکل چمکیلے نل فٹ ہوگئے ہیں ۔پلائی ووڈ ، سن مائیکااور پینل چپکا کر میز ،کرسی ،ٹیبل ، الماری سبھوں کو نئے سانچے میں ڈھال دیا گیا ۔کھڑکیاں نقرئی ہوگئی ہیں ۔

مگریہ سب یونہی نہیں ہوا ۔ اس کے لیے اسے بھاری قیمت چکانی پڑی ہے ۔ اب تک چکارہاہے ۔پرویڈنٹ فنڈ کی تہ ٹوٹ چکی ہے ۔ہر ماہ تنخواہ کاایک بڑا حصہ قسطوں کی نذر ہو جاتا ہے ۔مہنگائی بھی اس قدربڑھ رہی ہے کہ بچی کھچی رقم سے کھینچ تان کے گزارا ہوتاہے ۔اور اس پر تریشا کی یہ نئی فرمائش ! خداخیر کرے !!

اس نے کندھا اچکا کرجھولے کو سنبھالادیا ۔ڈور بیل پر انگلی رکھی ۔بٹن دبتے ہی چڑیوں کی چہچہاہٹ سے پوراگھر گونج اٹھا ۔

اور جب دروازہ کھلاتو تریشابنی سنوری ، نیلی پیلی بنگلہ تانت ساڑی کا آنچل سنبھالے تبسم افشاں تھی ۔ببھاش نے اسے دیکھااورمسکراتا ہوا اندر چلاآیا ۔

اندر آیا تو دیکھا ،رسوئی میں ماسی برتن سینت رہی ہے ۔ببھاش نے اپنا جھولا ایک طرف رکھا ،ماسی کو کن انکھیوں سے دیکھا اور کھسیاتا ہوا غسل خانے میں داخل ہوگیا ۔

تریشا رسوئی میں چلی گئی اور ماسی کو معنی خیز نظروں سے تکنے لگی ۔

ماسی بھی کچھ دیرخاموش اسے گھورتی رہی ۔پھر روہانسی صورت بناکر بولی ،''باچا ، کھوکامجھے اس طرح کھسیائی نظروں سے کیوں دیکھ رہاتھا ؟ ''

''نہیں نہیں ماسی ، ایسی بات نہیں ہے ۔ آفس میں کام زیادہ ہوگا ۔ تھکے ہارے آئے ہیں ۔ اس لیے موڈبگڑ گیاہوگا ۔ ''

اتنا سننا تھا کہ ماسی کے چہرے کارنگ ایک دم سے بدل گیا ۔لبوں پر تبسم کی موج ا منڈ پڑی ۔چہرے پر چہرہ اوڑھنے کے فن میں وہ اس قدر ماہر تھی کہ اچھے سے اچھا اداکارہ کو بھی بہت پیچھے چھوڑ سکتی تھی ۔وہ'موڈ' کا مطلب بھلی بھاتی جانتی تھی ،مگر اس لفظ کو پوری طرح ادا نہیں کرپاتی تھی ۔ موڈ کو 'موٹھ' کہتی اور شرم سے نظریں جھکائے ہولے سے مسکرا دیتی تھی ۔

وہ اس بار بھی مسکرائی ، پتلیاں نیم دائرے میں دائیں سے بائیں کی جانب گھمائی اور ہوک پر ٹنگی المونیم کی ایک چھوٹی سی کڑھائی اتارکر تریشا کے سامنے رکھ دی ۔ نظریں جھکاکر دبے لہجے میں بولی ،''باچا ،تویہ لو ، کھوکا کاوہ کیا کہتے ہیں ، 'موٹھ' ! ہاں ،'موٹھ' بنادو ۔ ''

ماسی بھی عجب خلقت ہے ۔بوڑھی ہے ،بیوہ ہے اوربیوہ کے تمام دھرم کا پالن بھی کرتی ہے ۔سفید ساری ، ترشے ہوئے بال ، تلسی کی مالا!کھان پان میں بھی احتیاط برتتی ہے ۔ لیکن لگائی بجھائی میں نارد منی کی تائی ہے ۔ اِس گھر کی اُس

گھر اور اُس گھر کی اِس گھر کرنے مینایسی طاق ہے کہ رائی کاپہاڑ بنادینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اس کی یہ فطرت ببھاش کوقطعی پسند نہیں ۔

اور اس دن تو وہ ایک دم سے اکھڑ گیا تھا جب اس نے دیکھا کہ وہ ہاتھ چمکا کر ،ہونٹ بچکا کر ، دیدے مٹکامٹکا کر تریشا سے کہہ رہی ہے ،''باچا ، کتنا سندر رسوئی ہے اُن لوگوں کی! جھانس ، دھوئیں کا جھنجٹ نہیں۔ نہ آنسو نہ کھانسی ،گھر کی سوبھا(شوبھا) بھی بڑھ جاتی ہے ۔ اورسمّان بھی ۔ بجلی ،گیس ، سمے ،پریسم(پریشرم) سب بچتے ہیں!!!''

ہاتھ چمکا کر ،ہونٹ بچکا کر ،دیدے مٹکا کر اپنی بات اس ڈرامائی انداز میں کہتی ہے کہ سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کی بات سن کر تریشا ایسی مچل اٹھی کہ دوسرے ہی دن گنگولی باڑی جا ٹپکی۔ گنگولی دیدی نے بھی اپنی نئی رسوئی کی جی کھول کر تعریفیں کیں۔الفاظ وہی ماسی کے تھے ،مگر اندازقدرے شائستہ تھا ،'' جھانس ، دھوئیں کا جھنجٹ نہیں۔ نہ آنسو نہ کھانسی ،گھر کی شوبھا بھی بڑھ جاتی ہے ۔ اورسمّان بھی ۔ بجلی ،گیس ، سمے ، پریشرم سبھی بچتے ہیں!!!''

اس کے بعد تریشااور گنگولی دیدی کے تعلقات پروان چڑھتے گئے ۔فون پر دونوں میں گھنٹوں باتیں ہونے لگیں۔اور ماسی بھی ہاتھ چمکا کر ،ہونٹ بچکا کر ، دیدے مٹکامٹکا کر ان کی باتوں کو تقویت بخشتی رہی۔اِس کی کہی اُسے اور اُس کی سنی اِسے مرچ مسالہ کے ساتھ لگاتی رہی۔

اب تریشا جھلّانے لگی تھی ۔ایک دن ببھاش پر برس پڑی ،''لوگ کیا کچھ نہیں خریدرہے ہیں۔اور ایک ہم ہیں کہ "

شکست خوردہ سپاہی کی طرح ببھاش کو خاموش یہ سب سننا پڑتاہے ۔توتان کرتے نہیں بنتا ۔

تریشا کے اس احساس کو حسدکہنا مناسب نہیں ۔ ہاں ،رشک کا نام دیا جا سکتا ہے ۔کیوں کہ اس کی بنیاد دوسروں کی کفالت نہیں ، اپنی کم مائیگی ہے ۔ اور ببھاش تریشا کی کم مائیگی کو چوٹالنا نہیں چاہتا ۔اسے پیار سے سمجھاتاہے ،''میری جان ،دیکھو ، مکان میں کتنے خرچ ہوگئے ہیں ۔قرض کتنا بڑھ گیا ہے ! کچھ دن ٹھہر جاو"

تریشا اندر ہی اندربھبک اٹھتی ، لال پیلی بھی ہوجاتی اور کبھی کبھار ایک آدھ تجویز بھی پیش کردیتی ہے ،''ایسا ہے تومیں پوجا میں ساڑی نہیں لوں گی ۔ گھومنے بھی نہیں جاوں گی اس بار ۔ پندرہ بیس ہزار تو بچ ہی جائیں گے "

-دو -

ببھاش ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا ۔اس نئے مسئلے کا حل ڈھونڈ رہا تھاکہ تریشا آئی ۔ ٹیبل پر ٹرے رکھ کراٹھلا تے ہوئے بولی ،''مچھلی کے انڈے کی کچوڑی ۔آپ کا پسندیدہ ناشتہ ۔"

بیوی کی اس بے وقت دل جوئی سے ببھاش ڈر گیا ۔سیانی عورت کبھی کبھی پیٹ کے راستے بھی مرد کے دل تک پہنچنا چاہتی ہے ۔اور مرد اگرببھاش جیسا شوہرہو تو عقلمندی کا یہی تقاضہ ہے کہ وہ قفل بر لب بیوی کو راستہ فراہم کرتا جائے ۔

ببھاش نے بھی یہی پالیسی اپنا رکھی تھی ۔وہ بیوی سے الجھنا نہیں چاہتا تھا ۔ویسے بھی سمجھ دار شوہر بیوی کی دلفریب مسکراہٹ کا تجزیہ نہیں کرتے ۔ اس کا لطف لیتے ہیں ۔ دلفریب مسکراہٹ کے درپردہ دل خراش مطلب بھانپ لیتے ہیں

۔ببھاش نے بھی بھانپ لیا ۔تریشا کی مسکراہٹ میں چھپی ماڈولر کچن کی طلب کو ۔چنانچہ اس نے برا نہیں مانا ۔ ہاں ،اپنی بے بسی اور کم مائیگی کا نوحہ گر ضرور ہوا ۔

اوردوسرے دن تو وہ بھونچکا رہ گیا!

جب اس نے ڈور بیل پر انگلی رکھی تو دروازہ تریشا کے بجائے کوٹ پینٹ میں ملبوس ایک نوخیز حسینہ نے کھولا ۔ گوری چٹی سڈول جسم والی اس خندہ رو حسینہ نے اسی کے گھر میں اس کا استقبال کیا ۔گرم جوشی سے بولی ،''ہیلو ، آئم ، مس آرتی شرما!''

اس سے پہلے کہ وہ تجسس کے سمندر میں غرق ہوجاتا ،بیوی کی آواز نے اسے سنبھالا دیا ،'' ٹی وی پر ہوم شاپنگ کا ایڈ آرہا تھا ۔میں نے فون کردیا ۔یہ وہیں سے آئے ہیں ۔ ڈیمو دکھانے ۔ "

ایک نوجوان سوٹ بوٹ پہنے تریشا کے پاس کھڑا تھا ۔ آگے بڑھ کر ہینڈ شیک کیااور بولا ،''ہیلو سر ،آیم ، سوربھ مکھرجی ،سنیئر سیلس ایکزکیوٹو فرام کچن اینڈ گیجٹ ، شیز مائی کولیگ ،مس آرتی شرما ۔"

ببھاش اندرہی اندر جھنجھلایا ۔اس نے بیگ ایک کونے مینرکھا اور بے دلی سے بولا ،''ٹھیک ہے ،دکھایئے ۔"

لڑکے نے کہا ،''سر ، آج باورچی خانے کا کانسپٹ بدل گیا ہے ۔ پہلے باورچی خانہ گھر سے باہر ایک کونے میں ہوتا تھا ۔لیکن آج یہ ہمارے گھر کا ایک importantحصہ بن گیا ہے ۔ویسٹرن کنٹریزمیں تو اس کی سجاوٹ پر خاص دھیان دیا جاتاہے ۔وہاں نئے نئے کنسپٹس آرہے ہےں ۔ وہاں لوگ باورچی خانہ کو کچن نہیں ،

بلکہ ماڈولر کچن کہتے ہیں ۔کیوں کہ یہ الگ الگ Modules سے بنے ہوتے ہیں ۔دیکھئے ان فوٹوکو ۔"

مس آرتی نے ایک البم آگے بڑھایا ۔ صفحہ پلٹتے ہوئے کہنے لگی ،''سر ، دیکھئے یہ الگ الگ ماڈیولس ہیں ۔چیمنی ،شٹر ،شیلف ،کبینٹ ،سینک ،باسکیٹ اینڈ پُل آوٹ ! اور دیکھئے ،جب یہ سب ایک ساتھ مل جاتے ہیں تو کتنا مارویلس کچن بن جاتا ہے ،جو گھرکےEnvironmentکو گلمرس ٹچ دیتا ہے"

تمام ڈیزائنس اورماڈلس دیکھ لینے اور ان کی خوبیاں جان لینے کے بعد تریشا کوایک ماڈل بھاگیا ۔

ببھاش نے قیمت پوچھی ۔

لڑکے نے سلری سلپ کی کاپی مانگی ۔ قرضوں اور قسطوں کی رقم دریافت کی ۔ اس کے بعدسر ہلاتے ہوئے کہا ،"سر ، آپ کا پے پکیج تو ٹھیک ہے لیکن ہوم ٹیک سلریSufficient نہیں ۔ آپ کو کم سے کم سیکسٹی پرسنٹ ڈان کرنے پڑیں گے ۔یعنی راونڈ اباوٹ سیونٹی تھاوزنٹ ۔باقی چھ انسٹالمنٹس میں ۔

سچ پوچھئے توببھاش کو بھی وہ ماڈل پسندآگیا تھامگربات قیمت اور ادائیگی کی صورت پر اٹک گئی ۔اس نے کہا ،''ٹھیک ہے ، ہم مشورہ کرلیں ،پھر آپ کو فون پر بتاتے ہیں ۔ ''وہ دونوں چلے گئے ۔ببھاش غسل خانے میں داخل ہوگیا ۔جی تو چاہا کہ بیوی کو جھڑک کر اس کے سر سے ماڈولر کچن کا بھوت اتاردے ۔وہ باہر آیامگر تریشا کو جھڑکنے کی ہمت نہ جٹا پایا ۔اس کے گلے میں بانہیں ڈال کربولا ،''آج باس اور ٹائم کے لیے کہہ رہے تھے ۔ آئندہ ماہ سے انکرمنٹ بھی مل جائے گا ۔بینک مینیجر سے کہہ کر دو چار قسطیں ملتوی کرادوں گا ۔بس دو چار مہینے ۔"

تریشا خاموش کھڑی رہی ۔اتنا کچھ ہونے کے باوجود وہی مرغی کی ایک ٹانگ ۔ اس سے پہلے کہ وہ ابل پڑتی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی ۔ ببھاش نے فون اٹھایا اور اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا ،''تمہاری گنگولی دیدی !''

اسے ببھاش کا لہجہ طنزیہ لگا ۔ اس نے جھپٹ کر فون لےااور صوفے پردے مارا ۔ فون بجتارہا ۔

ببھاش نے مارک کیا کہ تریشا کی پیشانی پر ایک ساتھ بہت ساری لکیریں ابھر آئی ہیں ،مگر وہ اس با ت کا اندازہ لگانے سے قاصر رہا کہ یہ لکیریں مایوسی کی ہیں یا غصے کی ۔

اورپھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بادلوں کی مانند پھٹ پڑی ،'' کہہ تو دیا کہ پوجا میں کپڑے نہیں لوں گی ۔ گھومنے بھی نہیں جاونگی ۔پھر بھی...''

اتنا کہہ کر وہ سسکیاں بھرنے لگی ۔ آنکھ کے کونوں سے آنسو کی دھار پھوٹ پڑی ۔

آنسوکی یہ دھار نسوانی شکست کا پرتو نہیں ، مجروح انا کا آئینہ دار تھی ۔آج صبح کو ماسی نے بھی کچن کا ذکر چھیڑا تھا ۔تریشا نے لہک کر کہہ دیا تھا کہ آج ڈیمو کے لیے آدمی آئیں گے ۔ کل خرید لیں گے ۔ پرسوں تک ڈلیوری ہوجائے گی ۔ ''

اور اس کی زبان سے جب لفظ 'ڈلیوری' ادا ہوا تھا تو اس کے اندرایک ساتھ خوشی کی کئی ترنگیں ابھریں جن کو ماسی نے بھی محسوس کیا تھا ۔مگر ببھاش کی بات سن کر تریشا افسردہ ہو گئی ۔سوچنے لگی ،'' اتنی بے عزتی کیسے برداشت کروں گی ؟''

وہ بپھرگئی ۔اس کے اندر ضدو اناکاایک پُرزورطوفان اٹھا اور دیکھتے دیکھتے اس سرگردان طوفان نے تریشا کواپنے نرغے میں لے لیا ۔اور اس نے یہ فیصلہ کرلیا

،’’جو بھی ہو ، میں اپنا سر نیچا ہونے نہیں دوں گی ۔چاہے کچھ بھی کرنا پڑے ۔ ضرورت پڑی تو اپنے زیورات بیچ دوں گی ۔مگر ہار نہیں مانوں گی ۔ ‘‘

اورزیورات کا خیال آتے ہی اسے وہ کنگن یاد آئے ،جو مرتے وقت ساس نے یہ کہہ کراس کے حوالے کیے تھے ،’’بیٹی ،میری ساس نے مجھے سونپے تھے ۔میں نے اب تک سنبھالا ہے ،لے اب تو سنبھال ۔‘‘

مگرکیا کیجئے انسانی خواہش تو پانی کی طرح ہوتی ہے ۔حد سے تجاوز کر تی ہے تو تکمیل کی کوئی نہ کوئی راہ تلاش کر لیتی ہے ۔ صحیح غلط ،جائز ناجائز ،بھلے برے تمام بندشوں کو پاش پاش کر دیتی ہے ۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہونے والا تھا ۔

رات کوجب ببھاش گہری فکر میں ڈوبا ہوا تھاتو تریشا دبے پاوں اندر والے کمرے میں داخل ہوئی اور الماری سے زیورات کا ڈبہ نکال لائی ۔ ببھاش کے سامنے رکھ کر پُرمعنی انداز میں تکنے لگی ۔

ببھاش نے ڈبے پر ایک سوالیہ نگاہ ڈالی ۔ بھوئیں جوڑ کرپوچھا ،’’کہیں سے دعوت آئی ہے ؟‘‘

تریشا لمحہ بھر خاموش کھڑی رہی ،پھرہونٹ پر دانت دباکر ، ببھاش کی گردن پر گوری گوری بانہیں ڈال دیں ۔چپک کر سینے پر رخساررکھتے ہوئے معشوقانہ انداز میں بدبدائی ،’’اس میں کچھ زیورات ایسے ہیں جو ہمارے کام کے نہیں ہیں ۔‘‘

”ہاں ،تو؟‘‘ اس نے تریشا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے پوچھا ۔

تریشانئی نویلی دلہن نہیں کہ زلفوں سے سوندھی میٹھی خوشبو آتی اورببھاش ہوش کھوکر اس کی نازبرداری میں جٹ جاتا ۔ ادھیڑ عمری کو پہنچتی ہوئی دس

سال پرانی بیوی تھی ۔ لہٰذااس نے ایک جرات مندانہ قدم اٹھانے کا منصوبہ بنایا ۔اسے پتہ تھا کہ اس کی زلفیں نئی نویلی دلہن کی زلفوں کی طرح معطر نہیں مگرگھنی کالی ریشم جیسی چکنی ضرور ہیں جن پر بیہاش

جیسے مرد کی انگلیا ں آسانی سے پھسل سکتی ہیں ۔ویسے بھی اس عمر مینعورتیں مردوں کو شیشے میں اتارنے کا گُرتوسیکھ ہی لیتی ہیں ۔

اس نے بیہاش کی روئیں دار چھاتی پرگداز گال رگڑے ۔ پلکوں کے تیر چھوڑے ،تیغ ابرو سے نشانہ سادھ کرکہا ،"ساٹھ ستر ہزار تو مل ہی جائیں گے ۔آرام سے آجائے گا اپنا اسمارٹ کچن ۔" جھانس ، دھوئیں کا جھنجٹ نہیں ۔ نہ آنسو نہ کھانسی ،گھر کی شوبھا بھی بڑھ جائے گی ۔ اورسمّان بھی ۔ بجلی ،گیس ، سمے ،پریشرم سبھی بچیں گے !"

وہ سوچنے لگا ۔حیرت و استعجاب کے سمندرمیں غوطے لگانے لگا ،"آخر اس ڈبے میں کون سا زیور ہے جسے بیچ کر اتنے سارے روپے مل سکتے ہیں ۔ "

وہ سوچ رہا تھا کہ اچانک اس کے اندرایک بجلی سی کوند گئی ،"کہیں ، اس کی نظر ماں کے کنگن پر تو ؟"

اس کاشک صحیح ثابت ہوا ۔تریشا نے ڈبہ سے کنگن کاجوڑا نکالا اور کھنکاتے ہوئے اس کے آگے کردیا ،"دیکھ رہے ہو انہیں ؟"

بیہاش کی نگاہ کنگن کی جوڑی پر جم گئی ۔ ہکلاتا ہو ابولا ،" مگر یہ توماں کے "

"ماں کے تھے ۔لیکن انھیں سینت رکھنے سے کیا فائدہ ؟ "وہ تلخ الفاظ کو شیریں لہجے میں انڈیلتی گئی ، "اولڈ فیشن ہوگئے ہیں ۔ اتنے بڑے ہیں کہ میں تو پہننے سے رہی ۔ بکسے ہی میں پڑے رہتے ہیں ۔"

”تو اس کا مطلب انہیں بیچ دیں ؟“

تریشا میٹھی ہنسی ہنس کربولی ،’’نہیں ،انھیں رہنے دیں ۔ بکسے میں پڑے پڑے دو کے چار ہو جائیں گے ،ہے نا ؟اوراگر چور ڈاکولے گئے تو ؟“

”مگر‘‘ببھاش پھر ہکلایااور اس مرتبہ اس کی ہکلاہٹ دیکھ کر تریشا بھانپ گئی ،لوہا گرم ہورہا ہے ۔دھونکنی پھونکنے کی ضرورت ہے ۔

چنانچہ اس نے مزید کچھ نہیں کہا ۔دھیرے سے اٹھی اور اسے گھورتی ہوئی اندر والے کمرے میں چلی گئی ۔

ببھاش اکیلا بیٹھا سوچنے لگا ۔اور جب آدمی سوچنے لگتا ہے تو دماغ بھی الٹی سیدھی منطقیں پیش کرتا ہے ۔پھر یہ منطقیں دھیرے دھیرے دل پر حاوی ہونے لگتی ہیں ۔

ببھاش سوچتا رہا ۔دماغ نے بچپن کا منظر اس کے سامنے پھیر دیا ۔

۔تین ۔

ماں کے گورے اجلے ہاتھ ۔ہاتھوں میں لال سفید سنکھ کی چوڑیاں ۔ان کے درمیان ہلتے ڈولتے چمکدار کنگن ۔جھن جھن بجتے ہوئے ،کھن کھن کرتے ہوئے خوبصورت کنگن ۔ اس وقت اس کے بابا بھی زندہ تھے ۔

ماں جب پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی تو کنگن اس کے بالوں کو چھوجاتے تھے جیسے ماں کی محبت ،اس کا پیاران کنگنوں میں سمٹ آئے ہوں ۔

وہ ماں کا ہاتھ تھام لیتاتھا ۔انہیں نچاتا ،کھنکاتااور پکڑ کر جھول جاتاتھا ۔

ماں کہتی تھی ،’’ببھو ، شام کے وقت جب سنکھ بجنے کی آواز سنائی دے اور پرندے چہکارتے ہوئے اپنے اپنے گھونسلوں کی اور لوٹنے لگیں تو سمجھ لینا کہ سورج

ڈوب چکا ہے ۔ اندھیرا ہونے والا ہے ۔تیرے باپو کام سے لوٹتے ہوں گے ۔ تو بھی گھر لوٹ آنا ۔تیرے باپو آتے ہی تیرے بارے میں پوچھتے ہیں ۔“

اور کھیلتے کھیلتے جب اس کے کان میں سنکھ بجنے کی آوازآتی تو ماں کا چمکتا چہرہ نظروں کے سامنے پھرنے لگتااوراس سے پہلے کہ آس پاس کے مناظر رات کی سیاہی میں گم ہوجائیں وہ بھاگتا ہوا گھرلوٹ آتاتھا ۔

ماں آہٹ پاکر کواڑ کھول دیتی اور وہ اپنی بانہیں پھیلا دیتا ، مانا اسے اپنی چھاتی سے لگا لیتی ۔اس وقت وہ اپنی پسلیوں پر کنگنوں کی میٹھی میٹھی چبھن محسوس کرتا ۔ اوراسے یوں لگتاتھا کہ اس کی تھکن ان کنگنوں میں جذب ہوتی جارہی ہے ۔

اسے پوچھنے والا بابانہیں رہا ۔ممتانچھاور کرنے والے وہ ہاتھ بھی نہیں رہے ۔ بس یہ کنگن ہیں ،جواب چمکتے نہیں ، کھنکتے بھی نہیں ۔بس ڈبے میں بند پڑے رہتے تھے ۔ تریشا کہتی ہے یہ اولڈ فیشن ہوگئے ہیں ۔سائز بھی بے ڈھب ہے ۔اس لیے وہ انھیں نہیں پہن سکتی ۔بات یہاں تک توٹھیک تھی ،مگر اب ببھاش کویہ اندیشہ ہوچلاتھا کہ ماں کے یہ کنگن کہیں گھریلو فساد کی جڑ نہ بن جائے ۔ لٹ لٹاجانے کا خطرہ تو لاحق تھا ہی ۔

ادھر ببھاش ان خیالوں میں الجھاہواتھا اُدھر تریشا ہوشیار شکاری کی طرح جال بچھاکر ایک کونے میں دبک گئی ۔ کہہ گئی ،”مجھے جو کہنا تھا کہہ دیا ،اب فیصلہ آپ کو لینا ہے ۔“

ببھاش سوچتا رہا ۔دیر رات تک سوچتا رہا ۔تریشا نے بظاہر فیصلہ اس پر چھوڑ دیا تھا مگر اندر ہی اندر سوزشِ شوق میں تپ رہی تھی ۔اسے کچن چاہیے ہی

چاہیے ۔اس نے دور سے ببھاش پر نگاہ ڈالی ، مسکرا کر اپنی سوزش شوق کا رخ موڑااورببھاش کی روح کو اس کی گرمی سے پگھلادینے کا تہیہ کیا ۔

ببھاش ڈرائینگ روم میں بیٹھا ہوا تھا ۔آنکھیں موندے ،پیشانی پر سینکڑوں سلوٹیں ڈالے ، سوچ رہا تھا کہ اچانک اسے ٹی وی کی آوازسنائی دی ۔ دیکھا ،تریشا نیم عریاں کھڑی ہے ۔ڈی وی ڈی آن ہے ۔ اسکرین پرنظر پڑتے ہی سوچنے کا سلسلہ ٹوٹ گیا ۔ رگِ مردانگی پھڑک اٹھی ۔

ایسی نازک گھڑی میں عورت اکثر اپنی پیٹھ بسترسے لگادیتی ہے ۔ چاہتی ہے کہ مالِ غنیمت سمجھ کرمرد اس پر ٹوٹ پڑے ۔مگر یہاں تو گنگا الٹی بہہ رہی تھی ۔تریشا نے ببھاش ہی کو مالِ غنیمت سمجھ لیا ۔ فاتح فوج کی طر ح اُس پر ٹوٹ پڑی ۔

۔چار ۔

دوسرے دن شام سے پہلے ہی سارا سامان آگیا ۔ مسٹر مکھرجی اور مس شرمابھی ساتھ آئے تھے ۔ گاڑی سے سارا سامان اتارا گیا ۔ پکڑدھکڑ کر گھر کے اندرلایاگیا ۔مسٹر مکھرجی اور مس شرما نے مل جل کر کبینٹ لگائی ،ریک ،چیمنی ، اسٹو ،واش بیسن فٹ کیے ۔ببھاش بھی ان کا ہاتھ بٹا رہا تھا ۔کبھی ریک پکڑتا ، کبھی اوون اٹھاتا اور کبھی چیمنی کو سہارا دیتا ۔ اس پکڑ دھکڑ کے دوران اس نے سینے پردفعتاً ایک بوجھ سا محسوس کیا ۔ دل میں ٹیس سی اٹھی ۔

تریشاتو اپنی ہی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی ۔ جوش و ولولہ سے پھٹی جارہی تھی ۔ ہونٹ دبائے مسکرارہی تھی ۔

اب جھانس اور دھوئیں کا جھنجٹ نہیں رہا۔ آنسو تھے نہ کھانسی۔گھر کی رونق بڑھ گئی تھی ، اورسماج میں مرتبہ بھی ۔ بجلی ،گیس ، وقت ، محنت سبھی بچنے لگے!!

مگر ببھاش کے سینے کا بوجھ اور دل میں اٹھنے والی ٹیس برقرار تھے۔

دوسرے دن صبح ہی سے اس کی طبیعت اچٹنے لگی تھی۔ سینے کا بوجھ بڑھتا گیا۔ دل کی ٹیس بھی تیز ہوگئی۔دن کسی طرح اس نے دفتر میں گزارے اور شام ہوتے ہی وہ گھر لوٹ آیا ۔ دروازے سے سر ٹکائے کچھ دیر نڈھال کھڑارہا۔کندھے سے لٹکتے ہوئے جھولے کو انگلی سے سرکاکر نیچے گرایا۔ سیدھے کھڑے ہوکر ہتھیلی سے چھاتی دبائی ، دو چار لمبی لمبی سانسیں لیں ۔پھر بیل بجانے کے لیے بایاںہاتھ اوپرکیا۔مگرہاتھ بیل تک نہیں پہنچا۔

اس نے دائیں ہاتھ سے کوشش کی ۔پھر بھی ناکام رہا ۔

ایڑیاں اوپر کیں ،مگر بیل نہ چھو سکا۔

اور جب نگاہ اٹھائی تو اسے محسوس ہواکہ آج بیل کچھ زیادہ ہی اونچائی پر پہنچ گیا ہے۔کچھ دیرتک وہ مایوس نگاہوں سے اسے تکتا رہا۔پھر بائیں پسلی جھکائی ۔دائیں پسلی جس قدر چڑھ سکتی تھی چڑھالی۔بازوں کو اوپر کی جانب اس قدر لمباکیا کہ بغل کی ہڈیاں تک چٹخ گئیں ، پھربھی بیل اس کی پہنچ سے باہر رہا۔

اس کی مایوسی بڑھتی گئی۔دروازے سے جسم ٹیکے شکستہ حال کھڑا رہا۔ زمین پر پڑے جھولے کو پاوں سے ایک طرف ڈھکیلا اور پوری توانائی سمیٹ کر اس باروہ اچھلا۔

مگربے سود ، دوسرے ہی پل دھپ سے زمین پرآ گرا ۔ سرچکراگیا ۔آنکھوں کے آگے اندھیرا چھاگیا ۔ زانوں سے پیٹ اور چھاتی دبائے اکڑوں بیٹھارہا ۔

تبھی اسے ایک آواز سنائی دی ۔دور سے آتی ہوئی سنکھ کی آواز !

اس کا دل مسوسنے لگا ۔ بے قراری بڑھنے لگی ۔اور جب اس نے دروازے پر جھولتے کڑوں پرنظرینڈالیں تو اس کی آنکھیں بھر آئیں ۔

سنکھ کی آواز تیز ہوتی گئی ۔پرندے چہکارتے ہوئے اپنے اپنے گھونسلوں کو لوٹنے لگے ۔ سورج ڈوبنے کے تمام آثار نمایاں ہو گئے ۔

وہ روتا رہا ۔ دھندلائی نظروں سے ان کڑوں کو دیکھتارہا ۔پھر ہمک کراپنی دونوں بانہیں ان کی طرف پسار دیں ۔

⋆ ⋆ ⋆

(ماہنامہ آج کل’نئی دہلی 2012)